تفتہ اور غالب
فیس بک گروپ ۔ کتابیں پڑھیے
ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
ga
غالب اکیڈمی، نئی دہلی

سید حسین احسن۔
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے۔
03146951212
03448183736

تفتہ اور غالب

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

غالب اکیڈمی، نئی دہلی

اشاعت اوّل ۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

تعداد :- ایک ہزار

طباعت :- جمال پرنٹنگ پریس دہلی

قیمت :- ۳۵ روپے

انتساب

جناب نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی

کی نذر

برگِ سبز است تحفۂ درویش

فہرست

اظہارِ تشکر

'غالب اور آشفتہ' کی ترتیب واشاعت میں بہت سے بزرگوں اور دوستوں کی کرم فرمائیاں شامل رہی ہیں۔ ان میں سرِفہرست اسمِ گرامی جناب حکیم عبدالحمید صدر غالب اکیڈمی کا ہے۔ آپ نے مسودہ کو پسند فرمایا اور اکیڈمی سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اُردو کے نامور محقق اور ماہرِ غالبیات مالک رام صاحب نے مسودہ کو بہ نظرِ اصلاح ملاحظہ فرمایا۔ اس کی بہت سی خامیاں دور کیں اور بزرگانہ مشوروں سے نوازا۔ مزید براں اپنا قیمتی وقت صرف کر کے رائے عالی سے نوازا جسے
کے عنوان سے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔

جناب نواب محمد رحمت اللہ خاں شروانی کی ذاتِ گرامی مغتنمات میں سے ہے آپ کی علم دوستی اور علم پروری اظہر من الشمس ہے۔ آپ نے ازراہِ علم نوازی اس کتاب کو اپنے نام منسوب کرنے کی اجازت دی اور تالیف کے سلسلہ میں اپنے فقید المثال کتاب خانے سے استفادے کے مواقع فراہم کئے۔

محبِ گرامی ایم۔ حبیب خاں صاحب نے ہر ہر قدم پر اعانت کی، کتابت سے لے کر طباعت تک تمام مراحل اپنی نگرانی میں طے کرائے اور اپنے خلوص سے مجھے بہت سی پریشانیوں سے نجات دلائی۔ جناب ذہین حسن نقوی سکریٹری غالب اکیڈمی نے ذاتی دلچسپی لے کر کتاب کو شائع کرایا۔

ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔

محمد ضیاءالدین انصاری ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء

مقدمہ

دسویں صدی عیسوی کے آخر میں جو مسلمان یہاں آئے، وہ افغانستان سے آئے تھے کچھ مدت بعد ایرانیوں نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ ان دونوں کی زبان فارسی تھی۔ جب تیرھویں صدی کے آغاز میں یہاں اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو قدرتاً فارسی راج دربار کی زبان ٹھہری، حکومت کا سارا کاروبار فارسی میں ہونے لگا۔ حکمرانوں اور امراء سے وابستہ علماء اور دانشور طبقے نے اپنی تصنیف و تالیف میں بھی یہی زبان استعمال کی۔ ان کے ساتھ خط و کتابت بھی لامحالہ اسی زبان میں ممکن تھی حکومت نے یا علماء نے علوم و فنون کی ترویج یا اپنے ہم مذہبوں کو تعلیم دینے کے لیے جو مدارس قائم کیے۔ ان میں ذریعہ تعلیم بھی فارسی تھی، کلام الملوک ملوک الکلام تو ہے ہی۔ یہاں کی آبادی نے دیکھا کہ اگر ہمیں ارباب حکومت سے تعلق قائم کرنا ہے، ان کا موردِ الطاف و کرم بننا ہے، ان کے دلوں میں اپنے علم و فضل کی ساکھ پیدا کرنا ہے، تو لازم ہے کہ فارسی سیکھیں تاکہ وہ ہماری سُن اور سمجھ سکیں اور ہم ان کی۔ یہی احساس تھا جس نے یہاں کے ہندوؤں کو فارسی اور اس میں پوری استعداد حاصل کرنے پر آمادہ کیا۔

رفتہ رفتہ ہندوؤں نے فارسی کی تحصیل میں اتنی ترقی کی کہ استادوں کے کان کاٹنے لگے، بالخصوص کائستھوں میں بعض بہت ممتاز ادیب پیدا ہوئے۔ یہ امر واقع ہے کہ کائستھوں نے فارسی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کے خاص اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخری دور میں ہرگوپال بھٹناگر (کائستھ) سکندر آبادی متخلص بہ تفتہ مشہور استاد گزرے ہیں۔ کلام کی مقدار اور معیار کے پہلو سے ہندوستان کے بہت کم فارسی گو ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے باعث فارسی کی تدریس و تعلیم بے اعتنائی کا شکار ہوگئی ہے اور مستقبل میں بھی اس میں بہتری کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تفتہ

کے دیوان آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہوتے۔ وہ ایک مرتبہ چھپے تھے اور دوبارہ ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ایسے میں یہ امید رکھنا کہ کوئی اللہ کا بندہ تفتہ کے کلام کا مکمل جائزہ لے کر ہندوستان کے فارسی ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کرے گا۔ امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا !۔

ہمارے نزدیک اب تفتہ کی اہمیت بس اتنی رہ گئی ہے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ اس وقت تک غالب کے جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تفتہ ہی کے نام ہیں ان خطوط کے سرسری مطالعے سے بھی استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کی جو تصویر اُبھر کے ہمارے سامنے آتی ہے، وہ بے حد دل کش ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شاگرد نے اپنا کلام استاد کی خدمت میں بھیجا، استاد نے اس پر حسبِ ضرورت اصلاح دی اور اسے شاگرد کے پاس واپس بھیج دیا۔ یوں بات رسمی تعلقات سے آگے نہیں بڑھتی۔ لیکن غالب کے تفتہ سے تعلقات کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ان میں قُرب اور یگانگت کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے، جو غالب نے تفتہ کو لکھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا دونوں ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں شریک، نجی مسائل میں مشورہ، لین دین، آپسی دکھ درد میں شریک۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک میر مہدی مجروح کے سوا غالب کا کوئی دوسرا شاگرد استاد کے اتنا قریب نہیں تھا جتنا تفتہ۔

ضرورت تھی کہ غالب اور تفتہ کے تعلقات اور تفتہ کے تصنیفی کارناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔ بدقسمتی سے تفتہ کے مفصل حالات دستیاب نہیں ہوئے، دراصل اس کے لیے جتنی محنت اور کاوش کی ضرورت ہے، وہ نہیں کی گئی، بہرحال جو کچھ میسّر تھا۔ جناب ضیاء الدین انصاری نے یکجا کر دیا ہے گویا کام کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ اب خدا جس کو توفیق دے وہ اپنی محنت سے اس پر عمارت کھڑی کر دے

ہمیں ضیاء الدین انصاری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے ہم سب کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ۔

مالک رام

نئی دلی ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

تفتہ کے حالاتِ زندگی

تفتہ اُن کم نصیب شعرا میں ہیں۔ جن کی طرف ہمارے محققین، ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی نگاہِ التفات کم ہوئی ہے۔ وہ اپنے عہد میں بھی کم التفاتی کا شکار رہے اور آج بھی بے توجہی کا شکار بنے ہوئے ہیں حالانکہ بحیثیت شاعر اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے، اور مسلم الثبوت اساتذہ سخن کے علاوہ شاید ہی کوئی شاعر ان کے مرتبے کو پہنچ سکے۔ اس لحاظ سے یہ بات اور بھی زیادہ قابلِ افسوس ہو جاتی ہے کہ تفتہ پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ نتیجۃً وہ آج بھی قعرِ گمنامی میں پڑے ہیں۔ دنیائے ادب آج انھیں بالکل فراموش کر چکی ہے حیرت تو یہ ہے کہ معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی انھیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

جن تذکرہ نگاروں نے تفتہ کو اپنے تذکروں میں شامل کیا ہے ان میں نصر اللہ خاں خویشگی مؤلف گلشنِ ہمیشہ بہار، سید علی حسن خاں مؤلف صبحِ گلشن، محمد مظفر حسین صبا مؤلف روزِ روشن اور لالہ سری رام مؤلف خم خانۂ جاوید کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان سب کا ماخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سب کی فراہم کردہ معلومات بڑی حد تک یکساں ہیں۔ یہ ساری معلومات بڑی مختصر اور تشنہ ہیں۔ ان سے ہماری کسی طرح بھی سیری نہیں ہوتی۔ ان کے علاوہ جناب مالک رام نے 'تلامذہ غالب'، بیںا عرش ملسیانی نے فیضانِ غالب میں اور عبد الرؤف عروج نے 'بزمِ غالب' میں بھی تفتہ کا ذکر کیا ہے۔ عرش ملسیانی نے واضح طور پر مالک رام صاحب سے استفادہ کیا ہے اور عبد الرؤف عروج نے تو سراسر تلامذۂ غالب کی خوشہ چینی کی ہے اور بڑی حد تک اس سے نقل بھی کی ہے۔ اس طرح سب سے

زیادہ مفصل اور جامع معلومات مالک رام صاحب نے پیش کی ہیں۔ آپ نے روشِ عام سے ہٹ کر تفتہ کے خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

تفتہ، مرزا غالب کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ وہ تفتہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس کا اظہار غالب کے متعدد خطوط سے بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے بھی مرزا غالب سے دل چسپی رکھنے والے حضرات سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ غالب کے اس چہیتے شاگرد پر تفصیلی، محققانہ اور ناقدانہ کام کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور تفتہ ہر طرف سے محروم توجہ ہی رہے۔ ممکن ہے اس عام بے توجہی کا سبب یہ رہا ہو کہ تفتہ اول و آخر فارسی کے شاعر تھے، اردو کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوئے اور فراہم شدہ معلومات کے مطابق اُردو میں صرف ایک قطعہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا لیکن فارسی گو شعرا کے تذکروں میں بھی ان کا کوئی حال نہیں ملتا۔

تفتہ سکندرآباد کے ایک کایستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سکندرآباد صوبہ اتر پردیش میں ضلع بلند شہر کا ایک قدیمی قصبہ ہے۔ اس میں قدیم ترین خاندان کایستھ حضرات ہی کا ہے۔ لیکن تفتہ کے کایستھ ہونے کے سلسلہ میں تذکرہ نگاروں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ تذکرہ صبح گلشن میں انھیں قوم برہمن سے بتایا گیا ہے[1]:

> "تفتہ منشی ہرگوپال از قوم برہمن متوطن اضلاعِ شاہجہاں آباد و از ارشد تلامذۂ میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی والا نژاد است"

لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں نے انھیں کایستھ ہی لکھا ہے اور یہی درست ہے۔ ان کے خاندان کے دیگر افراد اب بھی سکندرآباد میں مقیم ہیں۔

---

[1] صبح گلشن: مؤلفہ سید علی حسن خان۔ ص ۸۷

اور بھٹناگر کائستھ کہلاتے ہیں۔ خود تفتہ کا مکمل نام منشی ہرگوپال بھٹناگر تفتہ سکندر آبادی ہے۔ اس طرح ان کا بھٹناگر کائستھ ہونا مستند ہو جاتا ہے۔ ان کے اجداد سلطان سکندر لودی کے عہد حکومت میں سکندر آباد میں آکر آباد ہو گئے تھے، اور حکومت وقت کی طرف سے عہدۂ قانون گوئی پر فائز ہوئے اسی کے ساتھ کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔ یہ عہدہ موروثی ہو گیا۔ اور نسلاً بعد نسل اسی خاندان میں چلتا رہا تفتہ بھی مدتوں اسی عہدے پر فائز رہے۔

تفتہ کے سال پیدائش کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب نے ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰/۱۷۹۹ء) لکھا ہے البتہ ماہ و تاریخ کا کہیں مذکور نہیں ہے۔ ان کی تعلیم قدیم طرز پر علوم متداولہ میں گھر ہی پر ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد موتی لال کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اسی ابتدائی تعلیم کا اثر تھا کہ انھیں فارسی زبانات دلچسپی پیدا ہوئی اور ذاتی شوق اور مطالعہ سے اس میں مہارت حاصل کرلی اور تمام عمر اسی میں مشق سخن کرتے گزار دی۔ اس طرح فارسی سخن سرائی میں انھوں نے وہ مرتبہ حاصل کر لیا جو ہندوستان میں کم شاعروں کو نصیب ہوا۔

ملازمت کے سلسلہ میں تفتہ پہلے اپنے وطن سکندر آباد میں منصب قانون گوئی پر فائز رہے پھر کچھ عرصے کے لیے کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مراد آباد صوبہ اترپردیش چلے آئے۔ صاحب گلشن ہمیشہ بہار، نصر اللہ خاں خویشگی کا بیان ہے[۱]

"بہ تحصیلداری کاشی پور ٹھاکر دوارہ ضلع مراد آباد در سال ملازم بود۔ حالا شنیدہ ام کہ بہ تخفیف در آمدہ۔ معلوم ندارم کہ دریں ولا کدام کجاست۔"

دراصل تفتہ اول و آخر شاعر تھے۔ دنیوی جھگڑے ان کے لیے وبال جان

---

[۱] گلشن ہمیشہ بہار: مؤلف نصر اللہ خاں خویشگی۔ ص ۹۹

تھے۔ وہ گوشۂ تنہائی میں زندگی گزارنا چاہتے۔ ملازمت کی پابندیاں ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ لہٰذا اس طرف دل جمعی سے کام نہ کر سکے اور بالآخر ملازمت سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے ریاستِ جے پور سے منسلک ہو گئے، لیکن اس کو بھی جلد ہی ترک کر دیا۔ جناب مالک رام کا بیان ہے: [1]

"انگریزی محکمہ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دی۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا لیکن یہ کھکیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہو گئے۔"

گلشن ہمیشہ بہار ۵۳-۱۸۵۲ء کے درمیان کی تالیف ہے۔ یہ پہلی بار رجب ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کے مؤلف کے بیان کے مطابق تفتہ کاشی پور میں ۵۳-۱۸۵۲ء تک ملازم رہے۔ اس طرح جناب مالک رام کا یہ بیان کہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد تفتہ ۱۸۵۰ء میں ریاست جے پور سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کچھ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ یقیناً ۱۸۵۳ء میں یا اس کے بعد قائم ہوا ہوگا۔

ان امور سے ہمیں تفتہ کی افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ آزاد منش انسان تھے۔ ان کی آزاد روی کسی قسم کی پابندی کو گوارا نہ کرتی تھی۔ اسی بنا پر انھوں نے ایک سے زاید بار ملازمت کو خیرباد کہا۔

خانگی زندگی کے سلسلہ میں تفتہ خاصے خوش نصیب رہے۔ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب رہی۔ اللہ نے انھیں اولاد بھی خاصی دی۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی سن شعور کو پہنچے۔ لڑکوں کے نام امراد سنگھ اور پتیمبر سنگھ تھے

---

[1] تلامذۂ غالب۔ ص ۶۳

صاحبزادی اور پتمبر سنگھ کی وفات تفتہ کی حیات ہی میں ہو گئی تھی۔ بڑے لڑکے امراؤ سنگھ نے طبعی عمر پائی اور ان کے بعد تک زندہ رہے۔ پتمبر سنگھ کی جدائی کا صدمہ تفتہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کوہِ الم کا بار اٹھانا اور صبر و قرار کا دامن تھامے رہنا ان کے لیے بڑا مشکل تھا۔ شاعری کر کے دل بہلاے اور غم غلط کرنے کی کوشش کرتے اس کی وفات پر انھوں نے ایک طویل مرثیہ کہا جو ۲۲۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی کیفیتِ قلب و جگر کا بڑے پُر درد الفاظ میں اظہار کیا ہے۔ یہ مرثیہ ان کے دیوان دوم میں ملتا ہے۔ اسی بیٹے کی یاد میں انھوں نے "تضمین گلستاں" نظم کی۔ اس کے شروع میں انھوں نے "سببِ تالیف" کے عنوان کے تحت اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اور پتمبر سنگھ کو یاد کر کے خون کے آنسو روئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ز فرزندانم آں فرزندِ کوچک　　　　کہ پتمبر ہے خواندیش ہر یک
چہ پتمبر در امرِ خیر ساعی　　　　چہارم مصرعے بود از رباعی
چہ پتمبر عزیزِ مصرِ جانہا　　　　زلیخائے متاعش کاروانہا
چہ پتمبر چراغِ خانۂ من　　　　دلِ من، جانِ من جانانۂ من

سخن رانم ز پتمبر در آنجا　　　　دُر افشانم ز پتمبر در آنجا

نگریم در سخن فزا یم آبے　　　　نویسیم بعد ازاں نادر کتابے
شود تا زندہ پتمبر دگر بار　　　　دہد دادِ مسیحائیم ہر بار

تفتہ نے اردو میں کبھی مشقِ سخن نہیں کی۔ ہمیشہ فارسی ہی میں "پرورشِ لوح و قلم" کرتے رہے۔ اردو میں ان کا صرف ایک قطعہ ملتا ہے۔ جو انھوں نے مرزا غالب کی وفات پر نظم کیا تھا۔ یہ قطعہ حسبِ ذیل ہے ؎

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے　　ہم سے ہزار ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال، صدق و صفا اور حسن عشق　　چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پادسر ہوئے

فارسی میں تفتہ نے چار ضخیم دیوان، 'تضمین گلستاں' اور 'سنبلستان' بطور یادگار چھوڑے۔ 'سنبلستان'، شیخ سعدی کی لافانی تصنیف 'بوستاں' کے جواب میں نظم کی گئی۔ اس کا نام مرزا غالب نے تجویز کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کو یہ نام قبول کرنے میں کچھ تامل تھا۔ لیکن غالب نے اسی نام پر اصرار کیا۔ ایک خط میں وہ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"صاحب سنبلستاں سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمہارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ رُخ کو گل اور زلف کو سنبل فرض کرتے ہیں۔ سنبلستان میں کیا عیب ہے۔ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔"

اس کا پہلا ایڈیشن رمضان ۱۲۷۰ھ میں شیو سہائے کے زیر اہتمام مطبع مرآت الصحائف میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس کی کتابت اور طباعت دونوں بہت ناقص ہیں۔ تفتہ نے اس کا ایک نسخہ غالب کی خدمت میں بھیجا۔ انکو بھی طباعت وغیرہ بہت ناپسند ہوئی جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا۔

"تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے، کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معشوق خوب رو ہے، بدلباس ہے۔"

یہ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت، طباعت اور کاغذ بھی بے انتہا ناقص ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مطالعہ میں بڑی الجھن ہوتی ہے۔ البتہ اس کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں مطبع نول کشور

سے شائع ہوا۔ بہت صاف اور عمدہ ہے اور مطبع نول کشور کی روایتی خوبیوں کا حامل ہے۔ یہ ۴۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

"تضمین گلستاں" ۱۲۷۴ھ میں مطبع نول کشور کانپور سے شائع ہوئی۔ یہ ۲۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت و طباعت ہر لحاظ سے معیاری ہے۔

مرزا غالب سے تعلقات

تفتہ مرزا غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں تھے۔ غالب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی ہر طرح سے دل جوئی کرتے تھے۔ تفتہ بھی اپنے استاد کے ساتھ انتہائی عقیدت اور احترام سے پیش آتے تھے۔ تفتہ کے نام مرزا غالب کے جو خطوط ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفتہ ان کے عزیز ترین شاگرد ہی نہیں بلکہ بے تکلف دوست بھی ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ غالب ان کو اپنی اولاد کی برابر عزیز رکھتے تھے تفتہ بھی ان کا اسی حیثیت سے احترام کرتے تھے۔ ان کو اگرچہ اپنے کمال فن پر ناز تھا تاہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ غالب کا فیضان ہے۔ "تضمین گلستان" کی ابتدا میں مرزا غالب کو بڑے احترام سے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی ہمہ دانی اور اپنی ہیچمدانی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے ؎

سخن اینست وبس من ہیچ نیوم — برآں نکتہ رس من ہیچ نیوم
بود تا میرزا غالب زمن شاد — خراب من سراسر باشد آباد
فدائی میرزا غالب دل وجاں — گدائی میرزا غالب دل وجان
چہ غالب ہم نوائے قیصر وجم — چہ غالب میرزا اے قیصر وجم
باہلِ فارس غالب، غالبِ ما — بہ از عرفی و طالب غالب ما
دُرے از درج تو راں چشم بددور — گو از سایہ کا ینجا سربسر نور
دگر از ہند گفتن روسیاہی ست — گواہ تفتہ از من تا بماہی ست
چو گویم تا چہ رحمت کرد با من — دگر نہ گو جناب او، کجا من
رسد نازش چہا بہ فرقدانم — رسانید از زمیں برآسمانم

بود ہر ذرہ او آفتابے | درش را خوانده ام روشن کتابے
اگر صد دفتر از مدحش نگارم | یکے باشد یکے از صد ہزارم

مرزا غالب کی وفات پر انہوں نے فارسی میں جو ترجیع بند نظم کیا ہے اس سے بھی اسی عقیدت و احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء میں مطبوعہ دیوان کے ایک طویل قطعے میں بھی غالب کے نکراد فن کی ستایش کی ہے اور بیس سال سے ان سے مشورۂ سخن کرتے رہنے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

چہ حاجت کہ آرم بلب نام شاں | مے عیش تا حشر در جام شاں
ازیں جملہ برتر یکے اہل دل | خوش آزاد مردے بحق مشتغل
اسد نام، غالب تخلص ہمی | ز آگہ دلی ہا نہ غافل دمی
لقب میرزا نوشہ، او را دگر | وزیں نام در دہر مشہور تر
بود مرشدِ تفتہ، از بست سال | نہ رفت از دل و دیدہ دریچ حالی
رقم ہرچہ زد، اول او را نمود | ازاں پس بہ اہلِ جہاں وانمود
نمود ایں خضر گوئی از التفات | بہ گم کردہ رہ، راہ آبِ حیات
صفاتش فزوں از بیان و لب | نہ من، صد چو من بے زبان تب

یہاں تفتہ مرزا غالب کی عقیدت کے نشہ میں سرشار نظر آتے ہیں اور ان کا ایک ایک لفظ عقیدت میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

تفتہ نے ابتدا میں مرزا قتیل سے مشورۂ سخن کیا۔ اس زمانے میں وہ راقمؔ تخلص کرتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اور ۱۲۳۱ھ میں قتیل کی وفات پر منقطع ہو گیا۔ تعجب ہے مرزا قتیل سے تفتہ کے روابط کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا۔ صرف نصراللہ خاں خویشگی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ؎

"... مولدش چکلۂ سکندر آباد در محلۂ قانون گویاں..."

تلمیذ مرزا قتیل است ۔"[1]

صاحبِ گلشن ہمیشہ بہار کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصیت سے اس لیے بھی کہ کوئی اور تذکرہ نگار اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ زمانہ تفتہ کی ناپختہ کاری اور نومشقی کا ہے۔ قتیل کی وفات کے وقت تفتہ کی عمر ۱۸-۱۹ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک از خود ہی مشقِ سخن کرتے رہے اور اپنے ذوق کو پروان چڑھاتے رہے۔ قتیل کے بعد مرزا غالب سے ربط قائم ہونے سے قبل کسی اور استادِ فن سے مشورۂ سخن کرنے کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ غالب سے ان کے روابط قتیل کے انتقال کے کافی عرصہ کے بعد قائم ہوئے۔

تفتہ مرزا غالب کی شاگردی کے رشتہ میں کب منسلک ہوئے اس کا تعین مشکل ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس طرف کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ جناب مالک رام نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا اور صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کر گئے:

> "ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے۔ حسین قلی خاں نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نورالعین واقفؔ بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعرگوئی کا شوق پیدا کیا۔"[2]

اور

> "جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر مرزا تفتہ بنا دیا۔"[3]

لیکن غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے زمانے کا تعین نہیں کیا۔ غلام رسول مہرؔ نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور سلسلۂ تلمذ قائم ہونے

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار۔ ص ۹۹ [2] تلامذۂ غالب۔ ص ۶۴
[3] ایضاً۔ ص ۶۵

کے زمانے کے تعین کی کوشش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

"غالب سے تلمذ کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ فارسی خطوں میں تفتہ کے نام ایک خط ہے۔ جو فروری ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا۔ یعنی اس سے پیشتر تفتہ شاگرد بن چکے تھے۔" [۱]

مولانا سے یہاں تسامح ہو گیا ہے۔ انھوں نے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ ۱۰ر فروری ۱۸۴۹ء کا ہے۔ مولانا نے ۱۸۴۸ء غلط تحریر کیا ہے۔ یہ خط 'پنج آہنگ' میں شامل ہے۔ اور اس کے جتنے بھی ایڈیشن ملتے ہیں سب میں ۱۸۴۹ء واضح طور پر دیا گیا ہے۔ پھر محض اس خط کی بنا پر دونوں کے روابط کے آغاز کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ اس خط کی عبارت سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ اردو میں تفتہ کے نام مرزا غالب کے ۱۲۴ خطوط ملتے ہیں لیکن ان میں سے کسی خط میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے دونوں کے تعلقات کے آغاز کا پتہ چلایا جا سکے۔ البتہ تفتہ کے چند اشعار ایسے ملتے ہیں جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور بڑی حد تک اس مسئلہ کے حل کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کے مرثیہ میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

در من و او بہ یاری بختم
تا چہل سال ماند صحبت ما

غالب کا انتقال ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ تفتہ کہتے ہیں کہ مرزا غالب سے ان کے تعلقات چالیس سال تک رہے اس حساب سے ۱۸۲۸ء یا اوائل ۱۸۲۹ء تعلقات کے آغاز کا زمانہ قرار پاتا ہے۔ مگر اس کو یقینی نہیں بتایا

---

[۱] خطوط غالب؛ مرتبہ غلام رسول مہر۔

جا سکتا اس لیے کہ یہ زمانہ غالب کے سفر کلکتہ کا ہے۔ وہ اگست ۱۸۲۶ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے اور تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ حالتِ سفر میں گذارنے کے بعد ۲۸، نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آ گئے۔ ظاہر ہے اس دوران تفتہ سے ان کا ربط قائم ہونا کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں۔ البتہ اتنا ممکن ہے کہ واپسی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ربط قائم ہو گیا ہو۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تفتہ ۱۸۳۰ء میں مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے مطبوعہ دیوان میں ایک طویل قطعہ ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

بود مرشد تفتہ از بست سال
نہ رفت از دل و دیدہ در ہیچ حال

اس سے بھی مذکورہ بالا خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تفتہ ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے۔ "تذکرہ روز روشن" میں ان کا ذکر راقمؔ کے تحت ہی ملتا ہے اور ایسے ہی کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے جو راقمؔ کے تحت کہا گیا تھا۔ اس کی عبارت ہے :

"منشی ہرگوپال ولد موتی لال قوم کایتھ متوطن سکندرآباد مضافات بضلع بلند شہر کہ در صبح گلشن بہ تخلص تفتہ و قوم برہمن مذکور ..... دریں مقام سخنانِ ابتدای او کہ بتخلص راقمؔ موزوں کرد از نشترِ عشق چیدہ برای تفننِ ناظرین ثبت گردیدہ۔"[1]

مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے شفیق استاد کے ایما پر تخلص تبدیل کر کے تفتہ کر لیا اور پھر کبھی

---

[1] روز روشن۔ ص ۲۳۶۔ ۲۳۷

راقمؔ کو استعمال نہ کیا۔ اور اس تخلص ہی سے اتنے مشہور ہوئے کہ اب عام طور پر لوگ ان کے راقمؔ تخلص سے واقف ہی نہیں۔ دراصل یہ تبدیلی تخلص اپنے استاد محترم کی قائم کردہ روایت کا اتباع تھا۔ غالب ابتدا میں اسدؔ تخلص کرتے تھے مگر کچھ ہی عرصہ بعد اس کو ترک کر کے اسد اللہ غالبؔ بن گئے تھے۔ غالبؔ نے ان کا تخلص ہی نہیں بدلا بلکہ مرزا کا لقب بھی عطا کیا! اس طرح وہ غالب کی صحبت اختیار کر کے منشی ہرگوپال بفتہ گر راقمؔ سے 'مرزا ہرگوپال تفتہؔ' ہو گئے۔ غالب انھیں عام طور پر 'مرزا تفتہ' سے مخاطب کرتے تھے۔

غالب تفتہ سے بہت محبت کرتے تھے جس کا اظہار تفتہ کے نام ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ ان خطوط میں وہ تمام روایتی تکلفات سے بالاتر ہو کر انتہائی بے تکلفی کا طرز اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے قلبی تعلق کا سراغ ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری نظر سب سے پہلے القاب پر پڑتی ہے۔ غالب کی خطوط نگاری کی یہ اہم ترین خصوصیت ہے کہ وہ حتی المقدور فرسودہ اور طویل القاب و آداب سے احتراز کرتے ہیں۔ اور ندرت اور اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ مکتوب الیہ کے مرتبہ کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اپنے بے تکلف احباب اور شاگردوں کے نام خطوط میں ان کے القاب بے تکلفی اور سادگی کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے ایک ایک لقب سے اخلاص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ تفتہ غالب کے چہیتے شاگرد تھے لہٰذا ان کے نام خطوط میں ایسے ہی القاب استعمال کئے ہیں جن سے ان کا قلبی تعلق، شفقت، اخلاص اور بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے۔ چند القاب ملاحظہ ہوں:

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ	مہاراج	بھائی
برخوردار	جانِ من و جانانِ من	میرزا تفتہ

میاں۔ نور نظر، لخت جگر منشی صاحب

ان کے علاوہ محض شفقت، بے تکلفی اور ظرافت کا اظہار کرتے ہوئے اکثر ایسے القاب بھی استعمال کرتے ہیں جو بزرگوں اور قابل احترام شخصیتوں کو لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت مشفق میرے، کرم فرما میرے، صاحب بندہ، بندہ پرور، وغیرہ۔

تفتہ کے نام خطوط میں غالب اپنی فطری شوخی و ظرافت کا مظاہرہ بڑے یگانگت کے انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

"دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے لطف اس میں یہ ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے میں کچھ تکلف سے کام لیا اور ان کو لکھا کہ اصلاح کرنے میں آپ کو زحمت ہوتی ہو گی اور آپ یقیناً اس کام سے گھبراتے ہوں گے۔ اس کے جواب میں غالب نے انتہائی مشفقانہ لہجے میں تحریر کیا کہ اپنی اولاد کی حرکتوں سے کون گھبراتا ہے۔ تمہارے اشعار میرے معنوی پوتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان سے کیوں گھبراؤں گا۔ وہ لکھتے ہیں :

"سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے، کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں۔ میرے پاس آ رہے ہیں، اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ پس، تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان ظاہر صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں

میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا، تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا۔ آپ ان کو جلد میرے پاس بسبیلِ ڈاک بھیج دیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر ان کو تمہارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔"

غالب کو تفتہ سے بڑی انسیت تھی۔ اور عالم یہ تھا کہ اگر کبھی تفتہ کی طرف سے خط آنے میں تاخیر ہو جاتی تو غالب پریشان ہو جاتے اور ان سے خط بھیجنے کا تقاضہ کرتے۔ ایک بار تفتہ کی جانب سے تساہل کا اظہار ہوا اور کوئی ایک ماہ تک خط نہیں آیا۔ اس پر غالب نے انہیں بڑے حسرت بھرے لہجے میں تحریر کیا:

"کیوں صاحب، مجھ سے خفا ہو! آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا۔ یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا۔ کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا۔ یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔ سنو صاحب، اپنے پر لازم کر لو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کام آپڑا دو تین خط ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"

اسی طرح ایک اور موقع پر جب تفتہ کی طرف سے خط میں تاخیر ہوئی تو غالب اس کا تقاضہ اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں :

"کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں ؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے ۔"

ایک اور مرتبہ جب تفتہ کی طرف سے غیر معمولی کوتاہ قلمی کا اظہار ہوا تو غالب بے چین ہو اٹھے :

"کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا . . . دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو ۔"

۱۸۵۸ء میں غالب کی تصنیف "دستنبو" شائع ہوئی یہ ان کی معرکۃ الآرا تصانیف میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے ۱۵ ماہ یعنی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کے ہنگامے کے دوران دہلی کی روداد اور اپنی سرگذشت ٹکسالی فارسی زبان میں تحریر کی ہے اور اس بات کا التزام کیا ہے کہ اس میں عربی زبان کا کوئی لفظ شامل نہ ہونے پائے۔ مگر اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ غالب نے اس کا مسودہ تفتہ کے پاس بھیج دیا تھا وہ اس زمانے میں آگرہ میں مقیم تھے۔ وہیں نبی بخش حقیر اور حاتم علی مہر جیسے غالب کے مخلص احباب اور منشی شیو نرائن آرام جیسے نیازمند بھی موجود

تھے۔ ان چاروں حضرات کی زیر نگرانی دستنبو کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلایق آگرہ سے شایع ہوا۔ مطبع کے مالک منشی شیو نرائن آرام خود بھی غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی خصوصی توجہ سے اس کی اشاعت بڑے قرینہ سے ہوئی۔ غالب کو اس کی طباعت وغیرہ بہت پسند آئی۔ مرزا تفتہ کو ایک خط میں اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ کو ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب۔ دل خوش ہوا اور شیو نرائن کو دعا دی۔"

تفتہ کو غالب سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کا ایک ایک حرف اس سعادتمند شاگرد کے لیے بیش بہا دولت کی سی وقعت رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ غالب کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ منشی شیو نرائن آرام منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ۔ چودھری عبدالغفور سرور اور حاتم علی مہر جیسے نیازمندان غالب بھی اس سلسلہ میں تفتہ کے ہم نوا تھے۔ منشی ممتاز علی نے اس سلسلے میں تحریک شروع کی اور غالب سے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت چاہی۔ اسکے بعد شیو نرائن آرام نے کوشش کی لیکن غالب انکی اشاعت کیلئے رضامند نہیں ہوئے مگر شیو نرائن آرام اور تفتہ کا اصرار بڑھتا گیا لیکن غالب انکو پیہم انکار ہی کرتے رہے اس سلسلے میں شیو نرائن آرام کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"رقعوں کے چھاپے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور تفتہ کو عمل کرنا ضروری ہے۔"

اسی دوران تفتہ کا اصرار اور بڑھا اور غالب سے ضد کی جس کے جواب میں غالب ان کو انتہائی شفقت بھرے انداز میں اس ارادے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں

کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"

غالب کو اپنے اُردو مکاتیب شائع کرانے میں تامل اس لیے تھا کہ وہ ان کو معیاری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ گمان تھا کہ ان کے فارسی رقعات کے سامنے بالکل پھیکے اور بے مزا معلوم ہوں گے اور اس طرح ان کی عظمت پر حرف آجائے گا۔ اس وہم کا سبب یہ تھا کہ اُردو میں انھوں نے کوئی خط کاوش کر کے اور غور و فکر سے نہیں لکھا تھا بلکہ قلم برداشتہ اور سرسری طور پر لکھا تھا۔ لہٰذا ان کا یہ خیال تھا کہ ان میں وہ ادبی شان پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ جو ان کے فارسی رقعات کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے منشی شیو نرائن آرام کے نام مندرجہ ذیل خط میں کیا ہے:

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں؟ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

لیکن غالب کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم ان کے معتقدین نے ان کے مکاتیب شائع کر دیے۔ پہلے غالب کی حیات میں ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں ان کے انتقال کے تقریباً ایک ماہ بعد ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "اُردوئے معلّٰی" (حصہ اول) شائع ہوا۔ اور ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتبائی دہلی سے "اُردوئے معلّٰی" کے حصہ اول و دوم یک جا طور پر شائع ہوئے اور لوگوں نے دیکھا کہ جن خطوط کو غالب غیر معیاری اور سکے کا سد

سمجھتے تھے وہی اعلیٰ معیاری اور سکۂ رائج الوقت ثابت ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خطوط میں غالب کے فارسی رقعات کی سی نکتہ رسی، معنی آفرینی اور شوخی و ظرافت کے دلآویز مرقعے نظر نہیں آتے لیکن ان میں ایسی سادگی روانی، بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے جس نے ان کو فطری حسن سے مزین کر دیا ہے۔ اور آج غالب کی شہرت کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان میں اردو خطوط کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ غالب کو اپنے اردو خطوط کی اہمیت اور معیار کا احساس ہوگیا تھا اور اپنے نیازمندوں کے اصرار پر خطوط کی اشاعت کے لیے رضامند ہو گئے تھے۔ چنانچہ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں میں نے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔"

یہ وہی کام ہے جس کی شیونراین آرام اور میرزا تفتہ کو سختی سے ممانعت کر چکے تھے۔ اور اب نہ صرف اس کے لیے رضامند ہو گئے تھے بلکہ ان کی یہ شدید خواہش بھی ہو گئی تھی کہ یہ چھپ کر جلد از جلد منظر عام پر آجائیں۔

تفتہ مرزا غالب کو اپنا مشفق اور بزرگ سمجھتے تھے۔ اسی لحاظ سے ان کو غالب سے گہری عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اپنے شفیق

استاد کی خدمت ہی میں بسر کرنا چاہتے تھے۔ غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور تقریباً دو ماہ وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران تفتہ نے مرزا غالب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انھیں بھی رام پور بلا لیں۔ اس کا مقصد ایک طرف تو یہ تھا کہ غالب کے توسط سے ریاست میں ملازمت مل جائے یا وظیفہ مقرر ہو جائے اور دوسری طرف ان کا مقصد غالب کی خدمت میں رہ کر ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہنا تھا۔ غالب نے انہیں جواب دیا کہ اگر میرا قیام یہاں مستقل ہو گیا تو بلا لوں گا۔ وہ کہتے ہیں:

"دوسری بات جو تم نے لکھی ہے وہ بھی مطابق واقعہ و مناسب حال نہیں اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلا لوں گا۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اس جواب سے تفتہ مطمئن نہیں ہوئے اور یہ سمجھے کہ غالب انھیں رام پور بلانا نہیں چاہتے۔ اس شبہہ کا اظہار انھوں نے ایک خط میں کیا بھی جس کے جواب میں غالب نے انھیں ان الفاظ میں سمجھایا:

"آخر لڑکے ہو بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرطِ اقامت بلا لوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا۔ نہ رہوں گا۔ زنہار نہ رہوں گا۔"

غالب اس چہیتے شاگرد کو فی الواقع اپنے پاس بلا لینا چاہتے تھے۔ انھیں ہمہ وقت اس کی فکر بھی لاحق تھی۔ لیکن حالات سازگار نہ ہوئے اور وہ اپنے اس ارادے کو عملی شکل نہ دے سکے۔ دراصل وہ یہ چاہتے رہے کہ غیر یقینی صورت حال ختم ہو اور مستقل قیام کی صورت پیدا ہو جائے تو مرزا تفتہ کو اپنے پاس بلا لیں۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر مراد آباد اور

وہاں سے رام پور آ جائیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت
یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا
ہوا تو فوراً تم کو بلالوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں وہ باہم
بسر ہو جائیں۔"

لیکن حالات کچھ اس نوعیت کے بنے کہ غالب کو مستقلاً رام پور میں رہنا نصیب نہ ہوا اور ڈیڑھ ماہ سے کچھ زائد قیام کر کے ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس طرح تفتہ کا رام پور جاکر مرزا غالب کے ساتھ قیام کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

غالب کو تفتہ سے بڑی محبت تھی اور ان سے تعلقات کو غالب اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"جو کچھ تم نے لکھا یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ، تم
سے اور آزردگی! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں
ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور
تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو
رہا غماز کا کہنا، اس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا
وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار
ہوتا اور تمہاری برائی کہتا، تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس
سے آزردہ ہوتا۔"

غالب کے تعلقات اپنے شاگردوں سے ہمیشہ اچھے رہے۔ غالب ان کے ساتھ شفقت اور بزرگی سے پیش آتے۔ اور ان کی دل جوئی کرتے انھوں نے کبھی ان کے کلام پر اصلاح دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اور نہ ہی کبھی غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ اسی طرح وہ اپنے احباب کے ساتھ بھی خلوص سے پیش آتے اور حتیٰ المقدور ان کی بھی تالیف قلوب کرتے یہی سبب ہے

کہ ان کے احباب اور تلامذہ اُن پر جان نثار کرتے تھے۔ اور آڑے وقت میں اُنکے کام آتے تھے۔ اور حسبِ استطاعت ان کی معاشی پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان خدمت کرنے والوں میں تفتہ بھی پیش پیش رہے۔ وہ وقتاً فوقتاً ان کی امداد کرتے رہتے جس کی طرف اشارے ان کے نام غالب کے اکثر خطوط میں ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں غالب کی مالی پریشانیاں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی تھیں۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے لیکن اخراجات کی وہی رفتار برقرار تھی۔ حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان کا مُسلم حلقہ خود ابتلا میں گرفتار تھا اس لیے اس کی طرف سے امداد کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ ایسے موقع پر ان کے غیر مسلم احباب و شاگرد کام آئے جس سے مرزا غالب اپنے کاروبارِ زیست کو جاری رکھ سکے۔ جناب مالک رام رقمطراز ہیں:ـ

"یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گذرے، آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبرگیری کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کئے لالہ مہیش داس شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ درد، پنڈت شیو جی رام اور ان کے لڑکے بال مکند نے بھی حتی الوسع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے خود دستنبو میں ان کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لیے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکریہ مجھ پر واجب تھا، وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چاروں صاحب بھی موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بے کسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔"

---

۵ ذکر غالب۔ ص ۹۴

تفتہ کے کلام پر اصلاح

غالب کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کے تلامذہ ہندستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کثرت کی سب سے بڑی وجہ غالب کی وسعتِ اخلاق اور وسیع المشربی تھی۔ اسی لیے ان کے نیازمندوں اور شاگردوں کے حلقے میں ہر مذہب و ملت اور ہر مسلک کے افراد شامل تھے۔ اس میں کسی مخصوص طبقہ یا گروپ کی کبھی تخصیص نہیں تھی۔ ان میں سلاطین بھی شامل تھے، نوابین بھی، شاہزادے بھی تھے اور ایسے افراد بھی جن کا شمار عوام میں ہوتا تھا۔ غالب ان سب کے ساتھ یکساں طور پر شفقت اور مہربانی سے پیش آتے، ان سب کے کلام پر اصلاح کا التزام کرتے اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ علالت یا کسی دوسرے سبب سے اصلاح کا کام وقت پر نہ کر پاتے تو اس کا عذر کر کے مسودہ واپس نہ کرتے بلکہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھتے اور حالات سازگار ہوتے پر اصلاح کر دیتے تھے۔ اور شاگردوں کو مایوس نہ کرتے۔

اصلاح سے متعلق غالب کے چند اصول تھے۔ جن پر وہ خود سختی سے پابند رہتے اور شاگرد کو بھی ان پر سختی سے کاربند رہنا پڑتا تھا جو اصلاح کی غرض سے ان کی خدمت میں اپنا کلام بھیجتا۔ ان کی سب کو یکساں طور پر پابندی کرنی پڑتی اور شہنشاہ شہزادہ، نواب یا عام آدمی غرض کسی کو بھی چھوٹ نہیں تھی۔ غالب کی عام ہدایت تھی کہ بغرض اصلاح جو کلام ان کے پاس بھیجا جائے، اس کی تحریر صاف، روشن اور خوشخط ہو تاکہ اس کو پڑھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ اشعار کھلے کھلے لکھے جائیں اور اشعار اور مصرعوں کے درمیان کافی جگہ ہو جس سے اصلاح شدہ عبارت

گنجلک نہ ہو جائے اور شاگرد کو اصلاح کے سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے تمام شاگردوں پر ان قواعد کی پابندی ضروری تھی۔

غالب اصلاح میں خاصے محتاط تھے۔ ان کی اصلاح محض برائے اصلاح نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے پیچھے مضمون کی ترقی اور معیار کی بلندی کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا۔ انھوں نے کبھی ایسی اصلاح نہیں کی جس سے شاعر کا اصل اور بنیادی مفہوم ہی بدل جائے بلکہ وہ خود کو اسی مفہوم کے دائرے میں رکھتے ہوئے اس انداز سے اصلاح کرتے تھے کہ محاورہ اور زبان میں بہتری پیدا ہو جائے اور غریب لفظ کی جگہ اعلیٰ اور معیاری لفظ آ جائے تاکہ شعر میں ہمہ جہتی ترقی ہو جائے اور شاعر کا بنیادی تخیل برقرار رہے۔ بالعموم دیگر اساتذہ کی طرح وہ شاگردوں کی طرف سے خود شعر کہہ کر بھی شامل نہیں کرتے تھے نہ ہی اپنے خارج شدہ اشعار شاگردوں کو دیا کرتے تھے۔ یہ ان کا خصوصی وصف تھا۔ جو شعر ان کو پسند آتا اس کی تعریف کرتے اور جو اصلاح دیتے اس کی توجیہ بھی کر دیتے تاکہ ایک طرف تو شاگرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور دوسری طرف جو اصلاح کی گئی ہے اس کی نزاکت کا علم ہو جائے۔ اس طرح ان کے شاگردوں پر اصلاح کی ضرورت اور اس کی خصوصیات واضح ہو جاتیں۔ اس طرز اصلاح کی بدولت ان کے شاگردوں کو خطوط کے ذریعہ اصلاح لینے میں وہی لطف حاصل ہوتا جو بالمشافہ گفتگو سے اصلاح لینے میں حاصل ہوتا۔ گویا مراسلہ میں مکالمہ کی خصوصیت ان کی اصلاح میں بھی جلوہ گر رہتی۔ شاگردوں کے نام غالب کے وہ خطوط جن میں ان کے کلام پر اصلاحیں ملتی ہیں شاہکار ادب پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں غالب نے زبان و ادب کے جو نکات حل کیے ہیں وہ ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں غالب کے سب سے زیادہ خطوط مرزا تفتہ کے نام ملتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان میں ایسے خطوط کی تعداد بھی کافی ہے جن میں تفتہ کے کلام پر اصلاحیں ملتی ہیں۔ ان خطوط میں

تفتہ کے کلام کی توصیف بھی ہے۔ غلطیوں پر تنبیہ بھی، اصلاح بھی ہے اور اصلاح کی توضیح بھی۔ اس طرح یہ خطوط محض بےتکی رقعات کی حدود سے تجاوز کر کے اقلیم فن و بیان کی سرحدوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور ادبی شاہپاروں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں تفتہ کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"۔۔۔۔ تمھاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں [illegible] ارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔"

ایک خط میں ان کے قصیدہ کی تعریف کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے چند نکات بھی بیان کیے ہیں:

"ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ وا چشم بد دور تسلسلِ معنی، سلاست الفاظ! ایک مصرع میں تم کو محمد اسحٰق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے ؎۔

چاک گر دیدم و از جیب بہ داماں رفتم

پہلا مصرع تمہارا اگر اس کے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جز و کا قصائد کا کہہ لو۔ مگر خبردار، قصائد بہ قیدِ حروف تہجی نہ جمع کرنا۔"

ایک خط میں تفتہ کی غلطی کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ ہے کہ "اعم" بہ تشدید لفظ عربی ہے ؏

"دیگر نتواں گفت انکس راکہ اعم است"

مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسان عجم نے یوں بھی

لکھا ہو۔ کاف نے اسقاط کی کیا توجیہ کروگے؟ اور پھر اس صورت
میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار اس شعر کو نکال ڈالو۔"
ایک اور قصیدہ کی اصلاح کے سلسلہ میں یوں نکتہ آفرینی کرتے ہیں:
"مرزا تفتہ صاحب اس قصیدہ کے باب میں بہت باتیں آپ
کی خدمت میں عرض کرنی ہیں:
پہلے تو یہ کہ "خنجر را" و "گوہر را" کو تم نے از قسم تنافر سمجھا۔
اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ تمہیں پیدا ہوتا
مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں، سلیم ؎
شراب نقل نخواہد، بگیر ساغر را   کہ احتیاج شکر نیست شیر مادر را
یہ غزل شاہ جہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے
ہند نے اس پر غزلیں لکھی ہیں۔
دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آگے ہوئے خالی
کیوں اڑادو؟ ضیاء الدین احمد خاں نام ہے، ہندی میں
رخشاں تخلص، فارسی میں نیر تخلص ؎
ہما نا نیر رخشاں ضیاء الدین احمد خاں
دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے! یہ نہ کہنا کہ شعرا ممدوح کا نام
ننگا لکھ جاتے ہیں۔ وہ بحسب ضرورتِ شعر ہے۔ جس بحر میں
پورا نام نہ آئے اس میں شوق سے لکھو جائز اور روا ہے۔
جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے اس میں فروگذاشت
کیوں کرو۔"
ایک خط میں یائے تحتانی کے اقسام، اس سے مختلف انداز کے مرکبات اور محل
استعمال سے بحث کی ہے اور زبان دانی اور تحقیق حروف کے دریا بہائے ہیں۔
"دیکھو پھر تم ننگا کرتے ہو۔ وہی "بلش" و "بیشتر" کا

قصہ نکالا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے
تحتانی تین طرح پر ہے۔
(الف) جزوِ کلمہ:

(مصرع) ہمائے بر سرِ مرغاں از آں شرف دارد
(مصرع) اے سرِ نامہ نامِ تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ
ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔
دوسری تحتانیِ مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں
بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی
بیانی۔ کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے توشوم،
"رہنمائے توشوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔
تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح:
توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: "آشنائی"۔ یہاں
ہمزہ ضرور۔ بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: آشنائے
یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا
نہ کہاؤ گے۔"

اسی طرح لفظ 'نیم' کے معنیٰ، اس کے محلِ استعمال اور اس سے مرکبات کے بارے
میں تحقیق کا جادو جگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نیم گناہ" و "نیم نگاہ"، "نیم ناز" یہ روزمرۂ اہلِ زبان
ہے۔ نیم بہ معنیٰ 'اندک' ورنہ گناہ کا آدھا، اور "نگاہ کی ادھوڑی"
اور "ناز آدھا"۔ یہ مہملات میں ہے۔ ان چیزوں کا مناقشہ کیا؟"

اس کے علاوہ متعدد خطوط میں انھوں نے لسانی مسائل کی طرف اشارے کیے
ہیں اور لفظ و معانی کے نکات حل کیے ہیں۔ ایک خط میں اس طرح گوہر افشانی

کرتے ہیں :

"'خالقِ معنی' بہ معنی 'معنی آفریں' صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح 'اللہ' میں مشدد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے 'الا' 'الہٰی' میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا۔ اتفاقِ سلف شرط ہے۔ 'الہٰی' میں جب اور کسی نے دو الف نہیں مانے تو ہم کیونکر مانیں۔

دویم بہ وزن 'جویم' غلط۔ 'دوم' ہے بغیر تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں تو 'دیم' پڑھیں گے اگرچہ لکھیں گے دویم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں 'دوی' درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثل 'زمی' بہ حذفِ نون۔ بلکہ بہ طریق قلبِ بعض دویم کا 'دوی' ہو گیا ہے۔"

ایک خط میں قافیہ کی نزاکتیں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"اس غزل میں 'پروانہ' و 'پیمانہ' و 'بت خانہ' تین قافیے اصلی ہیں۔ 'دیوانہ' چونکہ عَلم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ و ترکانہ و دلیرانہ و شکرانہ سب ناجائز و نامستحسن ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ کاشانہ و شانہ و افسانہ و جانانہ و فرزانہ یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے ساری غزل میں 'مردانہ' یا 'مستانہ' یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے . . ."

تفتہ کی طرح دوسرے شاگردوں کے نام بھی مرزا غالب کے
ایسے سیکڑوں خطوط ہیں جن میں تنقیدی اور تحقیقی اشارے ملتے
ہیں جن سے زبان وادب کے مختلف مسائل اور معائب ومحاسنِ
سخن کی نزاکتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے علاوہ زبان،
املا، الفاظ، ان کے معانی ومحل استعمال اور ردیف وقوانی
کی باریکیاں جیسے اہم مسائل سے بھی بحثیں ملتی ہیں۔ اس طرح
ان خطوط کی ادبی حیثیت کے علاوہ تنقیدی اور تحقیقی
اہمیت بھی ہو جاتی ہے۔

تفتہ تذکرہ نگاروں کی نظر میں

(۱) گلشن ہمیشہ بہار، مؤلفہ نصر اللہ خاں خویشگی [تالیف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء]
مطبوعہ: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔ ۱۹۶۷ء

تفتہ تخلص۔ ہرگوپال نام از قوم کایستھ کھتناگر است۔ مولدش چکلہ سکندرآباد در محلہ قانون گویاں، تلمیذ مرزا قتیل است۔ گویند مردے آزاد طبع است و لطیف مزاج۔ چندے بہ تحصیل داری کاشی پور کٹھاکر دوارہ متعلق مرادآباد در عمال ملازم بود۔ حالا شنیدہ ام کہ بہ تخفیف درآمدہ معلوم ندارم کہ دریں ولا کدام کجا ست۔ طبع خوش دارد و نکات موزوں در ہندی و فارسی می آرد۔ مطلع دیوانِ فارسی او این است۔

آب دگر افزود کسے نوک سناں را
اقبال بلند است شہادت طلباں را

(۲) گلستانِ سخن، مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر [تالیف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء]
مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۶ء

تفتہ تخلص منشی ہرگوپال متوطن سکندرآباد۔ عہد طفولیت سے سخن گوئی کی طرف مائل ہے۔ سنا گیا کہ اشعار فارسی سے دیوان ضخیم فراہم کیا ہے۔ راقم آثم تک سوا اس ایک شعر کے نہیں پہنچا۔ اگر یہی طرز گفتگو ہے تو نہایت خوش فکر ہے

اے نالہ سوی چرخ مرو گرم مرو
باپنبہ نہ زیبد سرِ آزار جواں را

(۳) صبح گلشن : مؤلفہ سید علی حسن خان۔ [تالیف ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء]

مطبوعہ : مطبع شاہ جہانی۔ بھوپال ۱۲۹۵ھ

منشی ہرگوپال از قوم برہمن متوطن اضلاع شاہ جہاں آباد و از ارشد تلامذۂ میرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی والا نژاد ست۔ بآتشِ عشقِ غزلان غزل تفتہ جگر و بتلاش مضامین برشتہ در ساحت خیال گرم تر جبلی پر گوست۔ کلام منظومش بسیار۔ پنج دیوانِ شعر دارد۔ ابیات ہر یکے ازاں قریب سیزدہ ہزار ہے

رہا ند از چنیں بیداشتہایت خدائے دل! | بدامش افتی و دیگر طمع داری رہائی را
کوچہ گردیہائی مارا اے کہ پرسی ماحصل | آفتاب آمد خطاب از ترغیب رسوائی ترا
بدبختیم ز خویش نہ تنہا برد مرا | خواب از شوم ز چشم تو شبہا برمرا
چند گوئی کہ نشاں نیست زخونیں کفناں | مگر ایں لالہ کہ بینی زشہیدان تو نیست
دردی کہ جانِ ما بلب آورد دوائے ماست | مرگے کہ رو بما نماید شفای ماست
تیغ افتاد از کفِ قاتل | زندگانی و بالِ گردن کیست
میدود چار سو نمیدانم | برق گرمِ تلاشِ خرمن کیست
حسرت ہلاکِ بیکسیِ آں کہ بردرت | با جانِ خستہ آمد و با چشمِ تر گذشت
منزلِ غم دل فگارِ من ست | عیشِ صد فرسخ از دیارِ من ست
مرگ اسیران را رہائی میدہد | مژدۂ مشکل کشائی میدہد
سالکانِ تفتہ جاں تنہا نہ محمل سوختند | راہ را در آتش انگندند و منزل سوختند
عاشقاں گرمِ تماشا چوں شدند از فرطِ شوق | بر رخِ معشوق دیدند آنچہ حائل سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود کہ ایں آتش دماں | طوق را کردند خاکستر سلاسل سوختند
حالِ باغ از من مپرس اے محفل پیش تو گرم | لالہ ہائے تو برنگِ شمعِ محفل سوختند
مشربِ گبر و برہمن و اتقا آتش فگن | تفتہ ! باحق ساختند آنانکہ باطل سوختند
اے تماشا گاہِ ایں دل بروئے تو | عالمی در دل تماشا کردہ ایم

ما نہ تنہا دیدہ پرنم کردہ ایم — آنچہ نتواں کرد آنہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی ہا عالمی — رفتہ ایم و سیر عالم کردہ ایم
آفتاب بخشش آمد در کسوت — گریہا بر حالِ شبنم کردہ ایم

اے زخم بو سمت، لبِ خندانِ کیستی — لے داغ بو یمت، گلِ بستانِ کیستی
ایں کمی خواہم نسیم باغم اے دلربا شوے — بر چراغِ مدعای مدعی صرصر شوے
خوش دم صبح دعا را تیز اثر ایں دم مرا — گر چشانی قطرۂ مے ساقیِ کوثر شوے

(۴) روزِ روشن: مؤلفہ مظفر حسین صبا کی تالیف [۱۲۹۵-۹۶ھ / ۱۸۷۸-۷۹ء]
مطبوعہ: مطبع شاہجہانی۔ بھوپال، ۱۲۹۷ھ

راقی۔ منشی ہرگوپال ولد موتی لال قوم کایتھ متوطن سکندر آباد مضافات بضلع بلند شہر کہ در صبح گلشن بہ تخلص تفتہ و قوم برہمن مذکور الحال وی بہ ہمیں تخلص مشتہر ست و در "نشترِ عشق" نوشتہ کردی بفیض مطالعہ دیوان نور العین واقف پٹیالوی و تحریر تذکرہ نشترِ عشق بر سخن سرای و نکتہ سنجی قادر گردیدہ۔ نامہ نگار می گوید کہ قادر توانا طرفہ ذکاوت و استعداد در طبعش ودیعت نہادہ کہ باندک توجہ در سرشِ سودای شاہدان نظم افتادہ لکن بعد ازاں کہ زانوی تلمذ بخدمت غالبؔ دہلوی تہ کردہ پہلو بہ پختہ کاران ایں فن زدہ و دواوین عدیدہ برشتہ نظم کشیدہ۔ اگر حسین قلی خان نشترِ عشق تا ایں زماں زندہ بودی دفتری بمدحش تسوید نمودی دریں مقام سخنہائے ابتدائی او کہ بتخلص راقی موزوں می کرد۔ از نشترِ عشق چیدہ برای تفننِ ناظرین ثبت گردیدہ ؎

از خیالِ لب و دندانِ تو ای سیمیں تن! — آب یاقوت و در از چشم تر افتاد مرا
راست گویم کز تماشای قدش — عالمِ بالا نظر آمد مرا
پشت بہ دیوار دیا بانشست — کاشکے دیوار می بودیم ما
خراب و خستہ مرا یار دید و ہیچ نگفت — مگر زغصہ لبِ خود گزید و ہیچ نگفت

زراَئی تو چو ما سرگذشت پرسیدیم — کشیدہ آہ دگر یاں دریدہ پیچ گفت
بسکہ بالیدم بیادِ قدِ او — نالہ ام از عالمِ بالا گذشت
راَئی تو کز غمت بیمار بود — عافیت امروز از دنیا گذشت
آہ بیمارم و عیسیٰ نفسی پیدا نیست — بر سرم حیز ملک الموت کسے پیدا نیست
از دو دیدہ ہای اشکِ خود لیے شادم بلی — طفل چوں رفتن بیاموز و پدر خوش دل شود
وقتِ نزعم چو یارم آمد — ہنگامِ خزاں بہارم آمد
دلبرِ من بہر نمی آید — مطلبم آہ بر نمی آید

اے وادی ز خود خبر چگویم — از خود رفتم دگر چہ گویم
کشتۂ لعل تو ہستم ز انرو — مدفن خویش یمن می خواہم
نامِ من مبتلا چہ پرسی — دیوانہ و دردمند و خوارم
نشین در خانہ ام جانانۂ من — دگر نہ می نشیند خانۂ من

(۵) خمخانۂ جاوید (جلد دوم) ؛ مؤلفہ لالہ سری رام۔
مطبوعہ : دفتر خمخانۂ جاوید۔ دہلی، ۱۹۱۱ء

تفتہ = سخنور ہم پایۂ طالب و کلیم منشی ہرگوپال صاحب تفتہ الملقب بہ میرزا تفتہ حضرت غالبؔ مرحوم کے عزیز ترین اور ارشد ترین شاگرد تھے۔ فارسی کلام آپ کا اس پایہ کا ہوتا تھا۔ جسے سن کر اہل زبان ستایش کرتے تھے ہمیشہ فارسی کہتے رہے اردو کی طرف کبھی توجہ نہ ہوئی۔ ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور زیادہ حصہ عمر کا اپنے وطن سکندر آباد نواح دہلی میں گذار دیا۔ ۴ مجلد کلام فارسی میں جس میں ہزاروں غزلیں ظہوری، نظیری، صائب، حافظ، عرفی خسرو، جامی کی ہم طرح زمینوں میں ہیں ان سے یادگار ہیں۔ مرزا غالبؔ کو ان سے دلی انس ہی نہ تھا بلکہ انھیں اپنا سرمایۂ نازش سمجھتے تھے اور ہمیشہ عزیزداری کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ مرزا تفتہ کا لقب انھیں نے عنایت کیا تھا "اردوئے معلّٰی" میں اکثر خطوط ان کے نام موجود ہیں۔ عالم ضعیفی میں مرزا کی

وفات کے دس برس بعد انتقال کیا۔ ان کے اُردو کلام میں صرف حضرت غالب کی تاریخ وفات دستیاب ہوتی ہے جسے ہم تبرکاً درج ذیل کرتے ہیں ؎

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال صدق و صفا اور حسن و عشق چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

---

(۶) تلامذۂ غالب ؛ مؤلفہ مالک رام ـــ مطبوعہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر، ۱۹۵۷ء

دلی سے ۴۰ ـ ۴۵ میل شمال کی طرف ایک اچھا خاصا قصبہ سکندر آباد (ضلع بلند شہر) ہے جسے سکندر لودھی (۱۴۸۹ء ـ ۱۵۱۷ء) نے بسایا تھا۔ اسی کے زمانے میں ایک کھٹناگر کالیستھ خواجہ دیپ چند (خلف امر دیو) فیروز آباد (مضافات آگرہ) سے آ کے یہاں بس گئے۔ چنانچہ ان کے خاندان والوں کی آل آج تک "فیروز آبادی" ہے۔ اس خاندان کو ۵۴۰ بیگہ پختہ سعافی اور عہدۂ قانون گوئی موروثی ملا تھا۔

خواجہ دیپ چند کی اولاد میں ایک صاحب موتی لال ہوتے ہیں۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے جن کی اولاد "اٹھ گھرے" کہلاتی ہے۔ منشی ہرگوپال انھیں موتی لال کے بیٹے تھے ۱۷۹۹ء ـ ۱۸۰۰ء (۱۲۱۴ھ) میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمۂ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے لیکن شاعری کے شوق میں نوکری کو خیرباد کہہ دی ۱۸۵۰ء میں تھوڑے عرصے کے لیے ریاست جے پور میں بھی ملازمت کا تعلق ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کھکھیڑ بھی زیادہ دن تک نہ سہہ سکے اور جلد ہی مستعفی ہو کے کبرسنی میں ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ) کو سکندر آباد ہی میں وفات پائی۔ بدری کرشن فروغ نے تاریخ لکھی ؎

ستمبر سنم با بعالم گذاشت کہ از دہر سوے جناں تفتہ رفت

دوم روز در دہر ماتم دو چند | زجور فلک الاماں تفتہ رفت
سنِ عیسوی گفتم آخر فردغ | چہ سوئے جناں، زیں جہاں تفتہ رفت

(۱۸۷۹ء)

مولوی مختار احمد تھانوی نے ہجری میں تاریخ وفات لکھی ہے

سال نقلش با دل زار از خرد
من شنیدم بے سروپا شد سخن

(۱۲۹۵+۱ = ۱۲۹۶ھ)

اولاد میں دو لڑکے (امراؤ سنگھ اور پتمبر سنگھ) اور ایک لڑکی تھی۔ چھوٹا لڑکا پتمبر سنگھ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں فوت ہوگیا اس کی وفات نے ان کی کمر توڑ دی۔ اسی موقع پر انھوں نے ۲۲ شعر کا وہ طویل مرثیہ لکھا تھا جو ان کے دیوان دوم میں موجود ہے۔ گلستاں کی تضمین بھی اس کی یادگار کے طور پر لکھی تھی جیسا کہ اس کے آغاز میں صراحت کی ہے۔ صاحبزادی کا بھی جلد ہی اس کے بعد انتقال ہوگیا۔ امراؤ سنگھ ان کے بعد زندہ رہے۔ انھوں نے "سنبلستان" کے آخر میں اسی صاحبزادے کی شکایت لکھی ہے۔ اس کی اولاد اس وقت سنگرور (ریاست جیند) میں موجود ہے۔

تفتہ ابتدا میں راقمؔ تخلص کرتے تھے حسین قلی خان نے اپنے تذکرے (نشترِ عشق) میں لکھا ہے کہ نور العین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعے نے ان کے دل میں شعر گوئی کا شوق پیدا کیا۔ چونکہ ذکاوت اور استعداد سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی توجہ اور مشق سے بہت جلدی ترقی کر گئے نشترِ عشق میں جو انتخاب دیا ہے اس میں تخلص راقمؔ ہی ہے۔ مثلاً ؎

راقمؔ تو کز غمت بیمار بود | عاقبت امروز از دنیا گذشت
زراقمؔ تو چو ما سرگذشت پرسیدیم | کشید آہ دگر بیاں در ید و ہیچ نگفت

جب غالبؔ کی شاگردی اختیار کی تو انھوں نے تخلص بدل کر تفتہ اور مرزا کا خطاب دے کر "مرزا تفتہ" بنادیا۔ تفتہ استاد کے محبوب شاگردوں میں سے تھے اور انھوں نے ان کی تہذیب و تحسین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ تفتہ نے تمام عمر فارسی میں بسر کر دی۔ اُردو میں ان کے صرف اس ایک قطعہ کا پتہ چلتا ہے جو انھوں نے استاد کے انتقال پر کہا تھا ؎

غالبؔ وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے
ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے

فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن عشق
چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پادسر ہوئے

فارسی میں بہت بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ چار دیوان ہیں اور کسی میں بھی بارہ تیرہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ سعدی کی گلستاں کی تضمین لکھی۔ ایک مثنوی "سنبلستان" بوستاں کے جواب میں لکھی۔ تمام مشہور اساتذۂ فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے بلکہ تیسرا دیوان تمام تر خلاق معانی کمال اسماعیل اصفہانی کی طرحوں میں ہے اور کسی جگہ فارسیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس تحریر سے بطور نمونہ چند شعر درج کرتا ہوں ؎

رہا ندا ز چنیں بے دانشی ہایت خدا اے دل
بدانش افتی و دیگر طمع داری رہائی را

چند گوئی کہ نشاں نیست زخونیں کفناں
مگر ایں لالہ کہ بینی ز شہیدان تو نیست

دردے کہ جانِ ما بلب آرد دوائے ماست
مرگے کہ رو نماید شفائے ماست

تیغ افتاد از کف قاتل
زندگانی و بال گردن کیست

می دود چار سو نمی دانم
برق گرم تلاش خرمن کیست

حسرت بلاک بے کسی آں کہ بر درت
باجانِ خستہ آمد و با چشم تر گذشت

ایں اگر گویم کرا آید یقیں
قصد جانم یار جانی می کند

دل کہ با مرگ آشنائی داشت ست
زندگانی جاودانی می کند

سالکان تفتہ جاں تنہا نہ منزل سوختند
راہ را در آتش انگندند و منزل سوختند

عاشقاں گرم تماشا چوں شد تند از فرطِ شوق | بر رُخِ معشوق دیدند آنچہ حائل سوختند
بگذر از دیوانگانِ خود کہ ایں آتش بُہاں | طوق را کردند خاکستر سلاسل سوختند
حال باغ از من مپرس اے محفلِ عیش تو گرم | لالہ ہا بے تو برنگِ شمعِ محفل سوختند
مشربم گیرد نہ بہ زہد و اتقا آتش فگن | تفتہ! با حق ساختند آناں کہ باطل سوختند

اے تماشا گاہِ ایں دل روئے تو | عالمے در دل تماشا کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پُرنم کردہ ایم۔ | آنچہ نتواں کرد آں ہم کردہ ایم
دارد از خود رفتگی با عالمے | رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

---

(۷) بزمِ غالب، مؤلفہ عبدالرؤف عروجؔ۔
مطبوعہ ادارۂ یادگارِ غالب کراچی، ۱۹۶۹ء

ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ سکندر آباد کو سکندر لودھی نے آباد کیا تھا۔ اسی کے زمانے میں یہاں کالیتھوں کے ایک مشہور خاندان نے سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنی خدمات کے صلہ میں موروثی عہدۂ قانون گوئی سے سرفراز ہوا تھا۔ منشی ہر گوپال تفتہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

منشی ہر گوپال تفتہ کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ ہے۔ ان کے والد موتی لال نے ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر پر ہی کیا۔ ان کو فارسی سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے نہ صرف فارسی سیکھی بلکہ مختلف شاعروں کے دیوان بھی پڑھے۔ "نشترِ عشق" کے مؤلف کے بیان کے مطابق نورالعین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعہ نے تفتہ میں شعر گوئی کا ذوق پیدا کیا اور وہ تھوڑی سی مشق کے بعد اچھی خاصی غزلیں کہنے لگے۔ "نشترِ عشق" ہی کے مؤلف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں راضی تخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو اپنا تخلص بدل کر تفتہ ہو گئے۔ لیکن غالب نے اسے پیار میں مرزا ہر گوپال تفتہ بنا دیا۔

تفتہ نے کچھ دنوں انگریزی محکمۂ بندوبست میں قانون گو کی حیثیت سے کام کیا لیکن شاعری کا شوق ایسا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس سے دست بردار ہو گئے۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ان کو ریاست جے پور کی جانب سے ملازمت کی پیش کش کی گئی لیکن یہ تعلق بھی جلد منقطع کر لیا۔ ان کو غالب سے دلی خلوص تھا۔ ۱۸۶۷ء میں غالب بیمار ہوئے اور تفتہ کو خط و کتابت کے ذریعہ ان کی کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے مالی استطاعت نہ ہونے کے باوجود سکندرآباد سے دہلی کا قصد کیا۔ اور جب تک غالب کی کیفیت اپنی آنکھوں سے خود نہ دیکھ لی، مطمئن نہیں ہوئے۔

تفتہ کا چھوٹا لڑکا پتمبر سنگھ ۱۲۷۲ھ میں بیمار ہو کر انتقال کر گیا اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ یہ صدمہ تفتہ کے لیے انتہائی صبر آزما اور حوصلہ فرسا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے صبر و ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور شعر کہہ کہہ کر خود کو بہلاتے رہے۔

۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ کو انتہائی کس مپرسی کے عالم میں سکندرآباد میں انتقال کیا۔ ممتاز احمد تھانوی نے اس شعر سے ان کی تاریخِ وفات برآمد کی ہے ؎

سالِ نقلش یا دلِ زار از خرد   من شنیدم بے سر و پا شد سخن

تفتہ کو اردو شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، فارسی ہی میں لکھا۔ ان کا صرف ایک قطعہ اُردو میں ملتا ہے جو انھوں نے غالب کے انتقال پر لکھا تھا۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق انھوں نے چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ سعدی کی گلستاں کی تضمین بھی لکھی اور بوستاں کے جواب میں سنبلستاں لکھا۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

تیغ افتاد از کفِ قاتل   زندگانی وبالِ گردن کیست

نی دود چار سوئی دانم   برق گرم تلاش خرمن کیست

ایں اگر گویم کرا آید یقیں	قصد جانم یار جانی میکند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ	زندگانی جبا و دانی میکند
اے تماشاگاہ ایں دل روے تو	عالمے در دل تماشہ کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پُر نم کردہ ایم	آنچہ نتواں کرد آں ہم کردہ ایم
وارد از خود رفتگی با عالمے	رفتہ ایم و سیر عالم کردہ ایم

(۸) فیضانِ غالب : مؤلفہ عرش ملسیانی۔
مطبوعہ غالب اکیڈمی نئی دہلی ۱۹۷۷ء۔

منشی ہرگوپال تفتہ سکندرآباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے والد کا نام موتی لال تھا۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ فارسی کا شوق شروع سے تھا۔ انگریزی محکمۂ بندوبست میں مدتوں قانون گو رہے۔ ۱۸۵۰ء میں تھوڑی مدت کیلئے جے پور بھی گئے تھے لیکن شاعری کے شوق میں ملازمتیں ترک کر دیں۔ ۲ ستمبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہوئے۔ چھوٹے لڑکے پیتمبر سنگھ کی جوانمرگی پر بڑا دل دوز اور طویل مرثیہ لکھا ہے۔

پہلے راقی تخلص کرتے تھے۔ بڑے پُرگو تھے۔ چار ضخیم دیوان یادگار ہیں فارسی میں اساتذہ کی زمینوں میں دادِ سخن دی ہے۔ غالب سے گہرے مراسم تھے۔ وہ انہیں مرزا تفتہ کہتے تھے۔ اور اردوئے معلّٰی میں بہت سے خطوط ان کے نام ہیں۔

اُردو میں صرف ایک قطعہ ہے وہ استاد کی موت پر ہے

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جسکے فیض سے	ہم سے ہزاروں ہیچمداں نامور ہوئے
فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق	چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پادسر ہوئے

فارسی میں چار دیوان ہیں۔ ایک مثنوی سنبلستان بجواب بوستان سعدی۔

چار دیوانوں میں کسی میں بھی بارہ ہزار شعر سے کم نہیں۔ اساتذۂ فارسی کے جواب میں غزلیں لکھی ہیں۔

غالبؔ کے خطوط تفتہؔ کے نام

فارسی

خط بنام منشی ہرگوپال تفتہؔ

میرسد گر خویشتن نازد
غالبؔ از خویش خاکسار تر است

دریں ہنگام کہ روزِ سیاہ عمرم را شب است، و دانی کہ روزِ سیاہ را چگونہ تیرہ شبی تواند بود، از تاریکی تنگ دل بودمی و از تنہائی با خویشتن در جنگ تیز دل سودا زدہ من کہ چوں مرا تنہا نگریستے بیچارہ ناچار بہ بیکسیِ می سوختی ظلمت کدہ من چراغ نداشت، بر من بخشودند و کسی را سوی من فرستادند کہ خستگیہا ی مرا مرہم آورد و دردِ مرا بہمدمی چارہ گر آمد و شبم را ہزار اخترِ فروزندہ در کنار نہاد، ہما نا از نطقِ خویشتن شمعی برافروخت کہ بروشنیِ آں شمعِ فروزان صفای گوہرِ گفتارِ خویش را کہ در ہجومِ تیرگی بختِ من از چشمِ من نہاں بودی، آشکار دیدم. ہاں، ای تفتہ شیوہ بیان تو آئینِ تو ایں فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش فروغ خانی گوہر فروبیدہ فرہنگ را در دیدہ دری بکدام پایہ جا دادہ اند. با آنکہ سخن می گویم و سخن گفتن میدانم، تا ایں بزرگوار را ندیدم نفہمیدم کہ فہمیدنِ سخن چیست و سخن فہم کرا توان گفت در اقسانہادیدہ ام کہ خداوندِ

ستی بخش حسن را دو نیمہ کرد، یکپارہ از آں بہ یوسف بخشید و یکپارہ بر جہانیان فشاندند۔ شگفت کہ فہم سخن و ذوقِ معنی را نیز ہم چنیں دو لخت کردہ لختے بستودہ خوی دادہ، نیمۂ دیگر بہ دیگران ارزانی داشتہ باشند۔ گو چرخ گرد و ندبکام من نگرد و بختِ غنودہ سر از خوابِ گران بر ندارد کہ من بہ نشاطِ ہمدمی این دوست از دشمنی روزگار فارغم و بدیں دولت از دنیا قانع۔ جای شما سبز، روز و شب گرمیِ ہنگامۂ صحبت است و صحبتی نیست کہ شما را یاد نیاریم و گلۂ ہجرانِ شما نہ با ہم دگر نسرائیم۔ دیروز کہ آدینہ پانزدہم ربیع الاول و نہم فروری بود نامۂ شما رسید و پدید آمد کہ خالیا از اکبرآباد بہ متھرا و از متھرا بہ کول رسیدہ اید از آں دو ہزار بیت کہ خوشتہ اید کہ در اکبرآباد گفتہ ام، ماہم در اوراقِ اخبارِ اکبرآباد غزلی مشاہدہ کردہ ایم۔ خوش گفتہ اند براہی کہ ما میخواستیم رفتہ اند۔ منشی صاحب نیز این نامہ کہ بنامِ من بود خواندند و پیامی کہ ویژہ ایشان را بود فرا رسیدند۔ و از من خواستند کہ چوں نامۂ شما را پاسخ گزارم ورقی کہ نشتہ باشم با ایشاں سپارم تا در مکتوبِ خود فرو پیچند و بسوی شما روان دارند۔ فرمان پذیرفتم و ہم چنیں کردم و امروز کہ شنبہ فردای روز در رود نامی نامہ بودہ است این نامہ۔ بمخدوم سپردم اگر زود رسد از مخدوم سپاس نپذیرند و اگر دیر رسد بر من چشم گیرند کہ چرا نامہ بایشاں دادم و خود بڈاک نہ فرستادم۔ عمر و دولت روز افزوں باد۔

نامہ نگار اسد اللہ۔ شنبہ ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء

- - - - - - -

ترجمہ

ان دنوں کہ میری عمر کے روز سیاہ کی شب ہے، میری تیرہ شبی کا اندازہ کرو۔ اس تاریکی میں بے چارہ دل تنہا میری بے کسی پر جل رہا تھا کہ ناگاہ میرا ظلمت کدۂ بے چراغ روشن ہوا اور میرے زخموں کو مرہم اور درد کو درماں مل گیا۔ اور ایک شخص نے اپنے نطق کی شمع جلائی جس کی روشنی میں مجھ پر اپنے کلام کی خوبی آشکار ہوئی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نظر سے پوشیدہ تھی۔

ہاں اے نقشۂ شیوہ بیان و نو آیین نوا!

کیا بتاؤں کہ دیدہ وری میں اس روشن طبع دانشور نقشی نی بخش کا کیا پایہ ہے۔ میں ایک عمر سے شعر کہتا ہوں اور رموز شعر سے آگاہ ہوں لیکن جب تک اس بزرگ وار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی خود مجھے خبر نہ تھی کہ سخن فہمی کیا ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ یوسفؑ کو بخشا اور دوسرا ساری دنیا میں تقسیم کر دیا عجب نہیں کہ اسی طرح سخن فہمی اور ذوق معنیٰ کے بھی دو حصے کیے ہوں اور ایک حصہ اس فرزانۂ یگانہ کو بخشا ہو اور بقیہ دوسروں میں تقسیم کر دیا ہو۔ اب آسمان کی گردش میرے موافق حال نہ ہو، اور میری سوئی ہوئی قسمت اسی طرح سوتی رہے، تو بھی مجھے کوئی غم نہیں۔ میں اس دوست کے "نشاطِ ہمدمی" کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے پروا اور دولتِ دنیا کے مقابلے میں اس ایک دولت پر قانع ہوں۔

یہاں روز و شب محفل گرم رہتی ہے۔ کوئی وقت ایسا نہیں ہو۔

تمھارا ذکر رہتا ہو ۔کل جمعہ ۱۵ ربیع الاول (۹ فروری) کو تمھارا خط ملا۔ جس سے معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد سے متھرا ہوتے ہوئے کول پہنچ گئے ہو۔ ان دو ہزار اشعار میں سے جن کے بارے میں تم نے لکھا ہے کہ اکبر آباد میں لکھے گئے تھے، ایک غزل اکبر آباد کے اخبار میں نظر سے گزری۔ بہت اچھی غزل ہے۔ اس میں تم نے وہی روش اختیار کی ہے جو مجھے مرغوب ہے۔ منشی صاحب نے بھی تمہارا خط اور پیام پڑھا، جو تم نے ان کے نام بھیجا ہے۔ انھوں نے خواہش کی ہے کہ میں اپنا جواب لکھ کر انھیں دے دوں تاکہ وہ اپنے خط کے ساتھ تمھیں بھیج دیں۔ چنانچہ آج ہفتہ کو یعنی تمھارا خط ملنے کے دوسرے ہی دن میں نے یہ مکتوب ان کے حوالے کر دیا۔ اگر یہ تمھیں جلد مل جائے تو ان کا شکریہ ادا کرو اور اگر دیر سے ملے تو مجھ سے پوچھنا کہ اپنا خط انھیں کیوں دیا اور ڈاک سے کیوں نہ بھیج دیا۔

عمر و دولت روز افزوں ہو

اسد اللہ

شنبہ ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء

یہ ترجمہ پنج آہنگ (آہنگ پنجم) مترجمہ محمد عمر مہاجر، مطبوعہ ادارۂ یادگار غالب کراچی سے ماخوذ ہے۔

اُردو خطوط

(۱)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا۔ لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہر حال مجھ کو، کہ نالائق، ذلیل ترین خلائق ہوں۔ اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں؟ اپنا شیوہ ترک، ہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ "دیوانِ حافظ" کی بموجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے۔ اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شاہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمہاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمہارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بچلی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر

JOHN JACOB ٭

نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم ونثر کو مہمل کہیں گے کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم ونثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے!

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماراجبین سے کبھی نہ گیا۔ ایک نسخہ "طب محمد حسین خانی" میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سود مند ہے۔ مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں۔ اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے اس کو پییں۔ تبرید کی حاجت پڑے، وہ بھی اسی پانی میں پییں۔ روز جوش کروا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا آگے ان کو اختیار ہے۔

[اگست ۴۹ ۶۹]

(۳)

بھائی !

یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے فن تاریخ گوئی میں اس کو "کرامت" اور "اعجاز" کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان ساوجی و ظہیر کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعے کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرعے کی فکر کس واسطے! واہ واہ! سبحان اللہ!

اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سو کھا سا نسخہ ظہوری کا لکھا، بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں "پنج آہنگ" میں دس ہزار جگہ آیا

لہ دس ہزار کا لفظ محض ظرافتہً لکھا ہے۔ یعنی تم ہمارے قدیم شاگرد اور ہمارے کلام کے ورد رکھنے والے اور پھر تم کو یہ خبر نہیں کہ ہماری فارسی نثر میں یہ لفظ متعدد

بقیہ صہ ۵۴ پر

ہوگا۔ 'فر' اور 'فرہ' لفظ فارسی ہے، مرادف 'جاہ' کے پس 'جاہ' کو اور س کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ کہیے؟ 'عالی جاہ' اور 'سکندر جاہ' اور 'مظفر فر' اور 'فریدوں فر' یوں بھی درست۔

اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" کہنا بہت بے جا ہے۔ سنو، خطاب کے مراتب ہیں۔ پہلے تو "خانی" کا خطاب ہے، اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے: میر محمد علی یا شیخ محمد علی یا محمد علی بیگ اور اس کو خاندانی بھی "خانی" نہیں حاصل۔ پس جب اس کو بادشاہِ وقت 'محمد علی خان' کہہ دے۔ تو گویا اس کو "خانی" کا خطاب ملا۔ اور جو شخص کہ اس کا نام اصلی "محمد علی خان" ہے یا تو وہ قوم افغان [سے] ہے یا "خانی" اس کی خاندانی ہے: بادشاہ نے اس کو "محمد علی خان بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "بہادری" کا ہے: اس کو بہادری کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے یعنی مثلاً "محمد علی خان بہادر" اس کو "منیر الدولہ محمد علی خان بہادر" کہا اب یہ خطاب "دولگی" کا ہوا! اس کو بہادری کا خطاب نہیں کہتے۔ اب اس خطاب پر افزایش "جنگ" کی ہوتی ہے؛ "منیر الدولہ محمد علی خان بہادر شوکت جنگ" ابھی خطاب پورا نہیں، پورا جب ہوگا۔ کہ جب "ملک" بھی ہو۔ پس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمہارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر دیجیے یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے۔ جب تمھارا دیوان چھاپا جاوے گا یہ قطعہ بھی چھپ

بقیہ صـ ۵۳ کا

طور پر اور متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔ پس تمھاری غفلت کی مثال ایسی ہے کہ جو چیز دس ہزار بار دیکھی جائے وہ یاد نہ رہے۔ (غالب)

جاوے گا۔ مگر ہاں، منشی صاحب کے سامنے اس کو پڑھیے اور ان سے استدعا کیجیے کہ اس کو آگرہ بھیجیں تاکہ چھاپا ہو جاوے "اسعد الاخبار" میں اور "زبدۃ الاخبار" میں یقین ہے کہ وہ تمہارے کہنے سے عمل میں لادیں گے مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں لکھوں؟ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوایا ہے۔

(اگست ۱۸۵۰ء)

(۳)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا کوئی صاحب ہیں عطار اللہ خاں "اور" نامی "تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا، میں نے اس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں پڑھ کر حال معلوم کر وگے تمہارے شعر میں جو تردد تھا اس کا جواب میں نے لکھا ہے، تم کو بھی معلوم رہے:

"رفت آنچہ بہ منصور، شنیدی تو و من ہم
اے دل، سخنے ہست، نگہ دار زبان را"

تردد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا؛ "آنچہ بر منصور رفت" درست ہے۔ جواب: بائے موحدہ "علیٰ" کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس، جو کچھ "بر" سے مراد تھی وہ بائے موحدہ سے حاصل ہو گئی، اور اگر بائے موحدہ کے معنے معیت کے لیں، تو بھی درست ہے "نظیری" کہتا ہے:

"شادی کہ عین میکشی و دم تیزتی   در شہر ایں معاملہ باہر گدا رود"

اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں "معاملہ" ہے اور اس شعر میں "معاملہ" کا لفظ نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ "نظیری" کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور "تفتہ" کے ہاں مقدر ہے۔ "رفت" کا صلہ اور تعدیہ بائے موحدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے والسلام

اسد اللہ

[۱۸۵۱ء]

(۴)

کیوں مہاراج؟

کول! میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی، نہ لکھا کہ میں کیوں کر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا ہے، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کر دو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔

تمھارے ہات کی لکھی ہوئی غزلیں بابو صاحب کی میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں؟ ہر چند انھوں نے لکھا کہ اکبرآباد ہاشم علی خاں کو بھیج دو، لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے، تو میں ان کو وہ اوراق ارسال کروں گا یا تم جو لکھوگے اس پر عمل کروں گا۔

بھائی، ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ، چارم جنوری ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہر گوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

آپ کا وہ خط جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا پہنچا۔ بابو صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رند کے پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشارے اور فوائد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔ جب

تک کہ ان کا یا تمہارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو ، میں وہ کاغذ فرودی کہاں بھیجوں اور کیونکر بھیجوں اور کیوں بھیجوں ؟ اب جو تمہارے لکھنے سے جانا کہ ۱۹ ، فروری تک اکبر آباد آؤ گے تو میں نے یہ خط تمہارے نام لکھ کر لفافہ کر رکھا ہے ۔ آج اُنیسویں ہے پرسوں اکیسویں کو لفافہ آگرے کو روانا ہوگا ۔ بابو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا وہ خاتمہ ، اوراق اشعار پر لکھ دیا ہے ۔ تم کو چاہیئے کہ ان کی خدمت میں میرا سلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصول مرام کی مبارک باد دو اور اوراق اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پر مرقوم ہے اس کو غور سے پڑھیئے اور اپنا دستور العمل گردانیئے ، نہ یہ کہ سرسری دیکھیئے اور بھول جایئے بس تمام ہوا وہ پیام کہ جو بابو صاحب کی خدمت میں تھا ۔ اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اس شخص دکنی ، کا حال لکھا تھا معلوم ہوا ۔ ہر چند اعراض ان کا لغو اور پرسش ان کی بے مزہ ہو ، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں ۔ تمہارے شعر پر اعتراض ، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے ۔ گویا ہم پر ہے ، اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں ؛ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے ۔ جو زباں داں ہوگا ، وہ سمجھے گا ۔ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں ، ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ ؛ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے ، نہ واسطے اغیار کے ۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو ۔ آج تمہارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اس پر گرفت کر سکے ، مگر ہاں ۔

حسود را چہ کنم ، کو ز خود بہ رنج در است

والسلام والاکرام

رقم زدہ ۱۹ ، فروری و مرسلہ بست و یکم فروری ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۶)

بندہ پرور،

"بیش از بیش وکم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔ اس کو کون منع کرتا ہے؛ اور "جلال و اسیر" کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ در زبانِ من مہر بیش از بیش شد و در زبانِ تو وفا کم از کم شد"۔ استاد کیا کہے گا ؟ اس میں تو تین ٹکڑے کالف و نشر ہے: من اور تو، مہر اور وفا، بیش از بیش اور کم از کم۔ یاد رہے کہ "بیشتر از بیش وکم تر از کم" اگرچہ بہ حسبِ معنیٰ جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔ "بیش از بیش وکم از کم" افصح ہے۔ وہ شعر تمہارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے۔

قیس! از تو نہ ایم، فصلِ صبر — بیش است ترا، کم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر "کمتر" ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہر حال اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ "تر" کا لفظ افصح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے ؎

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم — حسن یا ایں تابہا کی آفتابے بیش نیست

"ور نہ چشم تو چہ از روزنِ دیوار کم است"

یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، فارسیت نہیں رہتی۔

"سہل مشمار زندگانی ہا"

مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے ؎

رایگان است زندگانی ہا — می توان کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے شراب کے نشے میں لکھا ہے اور اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب ع

گلستاں کے زندگانی ہا

اس کو موقوف کیجئے اور وہ مطلع رہنے دیجئے کہ وہ بہت خوب ہے۔ بعینہٖ مولانا ظہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی ہمارے اوراقِ اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو ہماری محنت تو ضائع نہ جاوے۔

"ایاغِ چند" میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے مثلاً معنی چند اور "احکام چند" اور "اسرار چند" یہ آدمی لکھ سکتا ہے۔ مگر ہاں "آمال ہا" یہ کھلی سہو ہے گ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں۔ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا　　　ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

میری جان! ایسے موقع میں یہ چاہیئے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور برا نہ کہے گا حضرت صائب کو۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط۔ البتہ میرا بھی موجبِ ملال ہے۔ مگر یہ کون واقعۂ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبانِ اخبار اس کو چھاپیں۔ آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمایئے۔

گر ماہ و آفتاب بمیرد، عزا مگیر
در تیر و زہرہ کشتہ شود، تو مخواں مخواہ

میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایے کو لے کر اس میں رہتا ہوں وہاں کا میرا رہنا تخفیفِ کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے۔ در دہلی بہ اسداللہ برسد کافی ہے۔ مگر اب لال کنواں نہ لکھا کرو محلہ بلی ماراں لکھا کرو۔

اور ہاں صاحب! ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو۔ مسہل سے فراغت ہوئی اور مزاج کیسا ہے؟ اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے؟ میرا سلام بھی کہہ دیجیے۔ والسلام

محررۂ دوشنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہر گوپال تفتہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔

اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آرہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمہارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالمِ صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں۔ میں نہیں تنگ آتا، تو ان معنوی پوتوں سے، کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟ آپ ان کو جلد میرے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیجیے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد ان کو تمہارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور ان کو دولت و اقبال دے اور تم کو ان کے سر پر سلامت رکھے اور تمہارے معنوی بچوں، یعنی نتائجِ طبع، کو فروغِ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرمائے۔ بابو صاحب کے نام کا خط ان کے خط کے جواب میں بھیجتا ہے۔ ان کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب بابو صاحب اور تم آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخِ روانگی لکھ بھیجنا، تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا۔

نگاشتہ جمعہ، ۱۸ جون ۱۸۵۲ء　　　اسداللہ

(۸)

کل تمھارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمھارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں، تو اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہتا ہوں کہ اے دل، تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پہ یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا، تو کیا کرتا؟ عیاذاً باللہ۔ اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ یہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو۔ بلکہ یہ بھی زائد ہے جو دوست سے کہیے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہرحال دوست کی دوستی سے کام ہے۔ اس کے افعال سے کیا غرض؟ جو محبت و اخلاص ان میں تم میں ہے، بدستور بلکہ روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، نہ سہی۔

وصلے کہ در آں ملال باشد   ہجراں بہ ازاں وصال باشد

آمدم برسرِ مدعا۔ تمہاری رائے ہم کو اس باب میں پسند، عجیب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ ان کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سوائے اس کے کہ تماشائی نیرنگِ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی۔

ببینم کہ تا کردگارِ جہاں دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہو سنا کانہ اُدھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا؛ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا؛ مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کر دوں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

تا نہالِ دوستی کے بر دہد   حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج کل میں آجائے گا۔ پھر اس کے جزو دان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا۔ ابھی "کول" میں آرام کرو، اپنے بچوں میں اپنا دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبرآباد چلے جائیو۔ وہاں اپنا دل بہلائیو، دیکھو، اس خودداری میں اُدھر سے کیا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا کرتے ہیں۔ والسلام۔

جمعہ، دہم دسمبر سنہ ۱۸۵۲ء

اسداللہ

(۹)

پرسوں تمہارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلوں کو رکھ دیا تھا۔ چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں، کل نو بجے، دس بجے ڈاک میں بھیج دوں۔ خط کچھ ضروری نہیں میں اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ "جانی جی" کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اس کا تم کو لکھوں۔ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ یہ طریقہ ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری " دیوان گزرا راول جی کے نام کا خط گزرا راجہ صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعداللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے۔ وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں۔ اور اب اجنٹ علاقہ جے پور کی راہ سے نہیں آتا، آگرے اور گوالیار، کرولی ہوتا ہوا اجمیر آئے گا۔ اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ پس، چاہیے کہ راول جی الٹے پھر آویں۔ اُن کے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اس میں دیوان کی رسید بھی ہو گی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈھتے اور تمہارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ نہ ان کو سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ ہاں یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے۔

اسداللہ

(۱۰)

بھائی!

پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط "جانی جی" کا لایا۔ تمھارے خط میں اوراقِ اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار۔ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر رہے اور میں بہت بے چین ہوں ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہوں اشعار بعد دو چار روز کے بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ، ۲۵ فروری سنہ ۱۸۵۳ء

اسد اللہ

(۱۱)

بھائی!

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے۔ اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو، تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو، اور اگر وقت نہ رہا ہو، تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی، کل سے اور بری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو۔ یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے؟ راجہ کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اس علاقہ میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبان انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے۔ یعنی جو رئیس مر جاتا ہے۔ سرکار اس ریاست پر قابض و متصرف ہو کر رئیس زادے کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بدستور قائم رہے۔ مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے

بابو صاحب میں اور اس مختار میں محبت کیسی ہے۔ رانی سے ان کی کیا صورت ہے
تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو، لیکن انھوں نے از راہِ دور
اندیشی تم کو متوسل اس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی
بسر کرتے تھے۔ زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے، جانی
جی کے ساتھ روشناسِ حکام والا مقام ہونا، پس چاہیے کول کی آرائش کا ترک
کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے
اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے۔ جانی جی بھرت پور آئے
ہیں یا اجمیر میں ہیں، کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے نہ مختصر
نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور
جلد لکھو کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا۔ آج صبح تک نہیں
گیا۔ اور یہ خط لکھ کر از راہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب
بیرنگ روانہ کرنا آدھ آنا ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط
کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے جب اس محلے
میں جانا ہوتا ہے تو اس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔

نوشتہ چاشتگاہ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

ضروری جواب طلب۔

(۱۲)

آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ
آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمہارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا
بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہوگئے، مگر ایک امر میں حیران
ہوں کہ کیا کروں یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا۔ میرے پاس
بھیجا ہے۔ اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اس کو الٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حالانکہ
تو لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سپاٹو یا آبو جاؤں گا۔ اور آج

پانچویں ہے۔ بس تو وہ کل روانہ ہو گئے۔ اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں! ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا، جب وہ آ کر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دیں گے، تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے۔ خط نہیں، پنڈت ھولال کا تھو غماز کی عرضی تھی بنام مہاراجہ بیکنٹھ باشی سعایت بابو صاحب پر مشتمل کہ اس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ، جانی جی کا دیوان اور ایک شاعر دہلی کا دیوان مہاراجہ جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی جی کی درستی روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے۔ اور اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے ان کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ تم کو میرے سر کی قسم، اب ہردیو سنگھ کو بلوا لو۔ میں امرِ خُرد کی کے واسطے امرِ کلّی کا بگاڑنا نہیں چاہتا۔ اس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجہ مرنے والا ایسا نہ تھا کہ ان باتوں پر نگاہ کرتا۔ اس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی تھی۔ فقط بارے اس خط کے آنے سے جانی جی کی طرف سے میری خاطر جمع ہو گئی مگر ایک فکر پڑی یعنی بابو صاحب آلو ہوں گے۔ اگر ہردیو سنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر ان کے ملے اور ان کے کہے مجھ تک کاہے کو آنے گا۔ خیر! وہ بھی لکھتا ہے کہ راول کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کے آنے پر رخصت ہو گی۔ دیکھیے وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔ تمہاری غزل پہنچی۔ یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمہارے پاس۔ گھبرانا نہیں۔ والدعا۔

نگاشتہ، سہ شنبہ، روز ورود نامہ

مرسلہ چہارشنبہ، ششم اپریل ۱۸۵۳ء- جواب طلب

از اسد اللہ

(۱۳)

بھائی!

تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپیے کا نوکر یا پنشن دار قرار دیا ہے

جو دس بیس روپیہ مہینا قسط آرزو رکھتے ہو تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔ اگر احیاناً تم دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیلِ کمپنی ہوتے تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال، خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپیے مہینا پنشنِ انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا تا ادائے زر۔ اینڈلے جون سنہ ۱۸۵۳ء یعنی ماہ آیندہ سے یہ قسط جاری ہوگی۔ بابو صاحب کا خط تمھارے نام پہنچا۔ عجب تماشا ہے، وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں ان کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق، آج میں نے ان کو لکھا اور کل راجہ کے مرنے کی خبر سنی۔ واللہ باللہ اگر دو دن پہلے خبر سن لیتا تو اگر میری جان پر آ بنتی، تو بھی ان کو نہ لکھتا۔ جے پور کے آئے ہوئے روپیے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی۔ شاید آج شام تک، یا کل تک آ جاوے۔ خدا کرے وہ بابو پہاڑ پر سے ہنڈوی روانہ کر دیں۔ ورنہ پھر خدا جانے کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زرِ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں۔ میری کمال خوشی ہے۔ اور یہ نہ ہو تو "۲۵" ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔ منشی صاحب کا ایک خط ہانسی سے آیا تھا۔ کل اس کا جواب ہانسی روانہ کر چکا ہوں۔ والدعا۔

محررۂ دوشنبہ ۳۰- مئی ۱۸۵۳ء

از اسداللہ

(۱۴)

بھائی!

ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبرآباد سے آیا، وہ لکھتا ہے کہ راجہ مرا، رانی (نہیں) مری۔ ابھی ریاست کا [illegible] قرار نہیں پایا۔ صورتِ انتظام جانی بجناتھ کے آنے پر موقوف ہے یہاں تک ان دوست کی تحریر ہے۔ ظاہرا اس کو بابو

صاحب کا نام نہیں معلوم۔ ان کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اس دوست نے یہ طریق اخبار لکھا ہے۔ اس کو میری اور ''جانی'' کی دوستی کا بھی حال معلوم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمہارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یا رب العالمین۔

صاحب، جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ ہم اس کا خیال کریں ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اٹھی۔ راجہ لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی صورت نکل آتی۔ اور یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ راجہ تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیش نظر رکھتا ہے۔ یہ بھی تو آپ از روے تحریر منشی ہر دیو سنگھ کہتے ہیں۔ ان کا بیان کیوں کر دل نشین ہو؟ وہ بھی جو بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ پانسو روپیہ نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے۔ ہولی ہو چکی اور بیں ے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ۔ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے؟ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور، بابو صاحب نے پہلے بار تو مجھ کو دو ہنڈیاں بھیجی ہیں۔ سو سو روپے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو بطریق نذرِ شاگردی۔ بعد اس کے دو ہنڈیاں سو سو روپیے کی بعد چار چار، پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے چار سو اور اس کے علاوہ تین سو اور چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالہ ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں۔ تو دو برس میں؛ اور اگر وہ تین برس کے ہیں۔ تو تین برس میں، میاں صاحب یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں جو میرے پرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا تھا۔ وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا؛ کوئی میاں حکمت اللہ ہیں۔ ان کا میرے مکان کے پتہ سے لایا تھا۔ وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میرے صاحب آجاویں

تو تم ان کو میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ حضرت اگر میرے واسطے نہیں تو اس خدا کے واسطے آپ دلّی آیئے۔

(۱۵)

تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم کی۔ بھائی کا ہاتر س سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا اسلام کہہ دینا۔ یہ تمہارا دعاگو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پورے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور ہو جاتا۔ یہ پانسو تو، بھائی کے تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ سو وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سود جو قرض ہے وہ بہ قدر پندرہ سے سو کے باقی رہے گا۔ اور وہ جو سو روپے صاحب سے منگوائے گئے تھے۔ وہ صرف انگریز سود اُس کے دینے تھے۔ قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال ہے۔ سو وہ دے دیئے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجاوے۔

بابو صاحب کے جو خط ضروری اور کاغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیئے اور اس میں لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔ پنجشنبہ پنجشنبہ ۱۵ دن آج پورے ہو لیے۔

نگاشتہ روز پنجشنبہ، نہم جون سنہ ۱۸۵۳ء

از اسداللہ

(۱۶)

عجب تماشا ہے! بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہر دیو سنگھ آگیا۔ اور پانسو روپے

کی ہنڈوی لایا ! مگر اس کے مصارف کی بابت انتیس روپے کئی آنے اس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے ہیں۔ سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے ان کو لکھا کہ مصارف ہردیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا۔ تکلیف نہ کرو۔ "۲۵" یہ میری طرف سے ہردیو سنگھ کو اور دے دو اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈی جلد روانہ کر دو۔ سو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اس ہنڈوی کے بھروسے پہ قرض داروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ وہ تقاضہ کرتے ہیں اور میں آج کل، کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں کہ سینکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں۔ تیس روپے کی کون سی ایسی بات ہے؟ اگر مصارف ہردیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا؟ انتیس اور پچیس، چون روپیہ نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔ لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے یا الٰہی یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؛ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی تو ظاہرا کوئی وجہ نہیں ہے۔ ناچار کثرت انتظار سے عاجز آ کر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اس کا جواب مجھ کو لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے۔ زیادہ، زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون سنہ ۱۸۵۳ء روز پنجشنبہ۔ جواب طلب

اسد اللہ

(۱۷)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور "۲" کی رسید اور "۵۰۰" کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے "۲۵" ہردیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہر حال ہنڈوی ۱۴ دن کی میعاد تھی ۱۰ دن

گزر گئے ۶ دن باقی ہے مجھ کو صبر کہاں ؟ جھٹ کاٹ کر روپے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس ۱۱/۴ ' نقد بکس میں، اور ۴ بوتل شراب کی اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علیٰ احسانہ۔ بھائی صاحب آگئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو۔ اور میرا سلام کہو۔ اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں ان کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آجائیں تو آپ کا ہلی نہ کیجیے گا اور ان کے پاس جائیے گا کہ وہ تمہارے جویائے دیدار ہیں۔

سہ شنبہ، ۱۴ جون سنہ ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۱۸)

بھائی،

میں نے مانا تمہاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فرصت نہ ہو گی؛ یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشست معنی ابھی ملحوظ رکھا کرو، اور جو کچھ لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔ کیوں صاحب یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا، اور وہ بھی دِتی سے سکندرآباد کو، آیا حاتم کے سوا، اور میرے سوا کسی نے کیا ہو گا! کیا ہنسی آتی ہے تمہاری باتوں پہ! خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو، تم کو دے۔ جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ ان کا حال لکھو۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے، مگر خط نہیں بھیجا جاتا۔ کہ وہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے وہ چل سکیں۔ بہرحال تم بھرت پور سے قریب ہو اور ان کے متوسلوں کو جانتے ہو ـــــ اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگواؤ اور جو کچھ تم کو معلوم ہو، وہ مجھ کو بھی لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبد اللطیف کول میں آگئے، میں ان کا خط مجھ کو آیا تھا۔ آج اس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یکشنبہ، ۲۱ ماہ اگست سنہ ۱۸۵۳ء اسد اللہ

صاحب،

دوسرا پارسل، جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریر سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا؟ اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟ ایک آدھ دو ورق زیادہ ہو جاتا۔ بہر حال، اب مجھے چننے پڑے ہیں، سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا میرا قصور نہ جاننا۔

"یلارہا ہے" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے "دیا" اس کا مخفف ہے۔

"قادہا در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن"

بہت خوب اور معقول۔ میں اس وقت جانے کس خیال میں تھا۔ "چوں خواہد شدن" و "کنوں خواہد شدن" ردیف و قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ "بے پیر" تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا، تو تم کو شعر فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا۔ میرزا جلال اسیر علیہ الرحمہ، مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں! لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیرزادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔

"شست بستن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرہ میں ان کے پیرو ہیں۔ "بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے۔ ورنہ صاحب زبان ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں۔

زاہدا، ایں سخنت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی
حق غفور است، گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی"، "ترا چہ شد" سوال ہو سکتا ہے۔

پھر "گناہے شدہ ام" یہ جواب مہمل۔ "گناہے کردہ ام" جواب ہو سکتا ہے۔
یہاں تم کہوگے کہ "ہمہ تن گناہ" یا "سراپا گناہ" یا "سراسر گناہ شدہ ام" یہ جواب
اس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک "ہمہ تن گناہ" نہ ہو معنی نہیں بنتے
ہرگز ہرگز۔ اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمہارا ہی رہا اور ٹکسال کے
موافق ہوگیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں
الجھ کر حقیقتِ معنی سے غافل رہے۔

بآزارِ دل خود از چنیں کار — آزار چہ می کنی دلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے۔ مگر ہاں اس نے ایک وجہ ٹھہرائی ہے یعنی "آزردن" مصدر
اور "آزارد" مضارع اور "آزار" امر۔ امر بمعنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد
"کردن" کے ساتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر رہنے دو۔

"کند آں آہوے وحشی زبیم فردارم"

یہ شعر مؤید میرے کلام کا ہے۔ "بردارم" و "زردارم" و "سردارم" و "فردارم"
یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں۔ الف ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں "بو دارد" و
"رو دارد" و "فرود آرد" تمہارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر
استاد کا نہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاء الدین۔

ما مقیمانِ کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ ان کو فقر و فنا و سیر و سلوک میں سند
سمجھنا چاہیئے، نہ انداز کلام میں۔

"پرِ مور است شمشیرے کہ پر موے میاں دارد"

بھائی، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی کی سند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک
مضمون ہے کمر : مور ؛ و تلوار : پرِ مور۔ وجہ تشبیہ : علاقۂ پرِ مور با مو
مانندِ علاقۂ شمشیر با میان۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں۔ انصاف شرط، تلوار
کی خوبی "تیزی" ہے یا "نازکی"؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ

باندھو، 'خو' میں اور "تلوار" میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو شعر سے ہاتھ اٹھاؤ۔

میاں 'خمیدن' بھی صحیح اور "چمیدن" بھی صحیح۔ اس میں کس کو تردد ہے؟ مگر لغت اور محاورے اور اصلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے باتونی لوگوں کو 'خم وچم' بولتے سنا ہے۔ آج تک کسی نظم ونثر فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا 'مجھ کو بھی پسند' مگر کیا کروں؟ جو اپنے پیشواؤں سے نہ سنا ہو، اس کو کیوں کر صحیح جانوں؟ 'چمید' صیغہ ماضی کا ہے 'چمیدن' سے اور 'چمیدن' ایک مصدر ہے، صحیح اور مسلّم۔ چمد مضارع 'چم' امر اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام 'خم وچم' میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کا جواب لکھ دیا۔ اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے، مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو۔ اور تم بھی جب ان اوراقِ طلسی کو دیکھو تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح نہ لکھنا۔ میں بہت گھبراتا ہوں۔

'خمیدست' و 'رسیدست' میں 'نرمی دست' یہ قافیہ درست ہے، مگر 'است کا 'الف' ہر جگہ اڑا دو۔ اور یاد رہے صرف سین تے، کافی ہے الف ضروری نہیں۔

غالب

(۲۰)

تمہارا خط پہنچا، مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی، ان چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کروگے تو کیا کروگے! کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل لیے ہوں۔ یہ سمجھنا کہ بیمار ہوں، حفظِ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمہارے اشعار غور سے دیکھ کر بھائی منشی نبی بخش صاحب کے پاس لفافہ تمھارے نام بھیجا

ہے۔ جب تم آؤ گے تب وہ تم کو دیں گے۔ جہاں جہاں تردد و تامل کی جگہ تھی وہ ظاہر کر دی ہے۔ اور باقی سب اشعار بدستور رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو یہ چاہیئے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اس لفافے کی رسید اور اپنا سارا حال مفصل لکھو۔ اس میں تساہل نہ کرو۔ بابو صاحب کے خط کا جواب اجمیر کو روانہ کر دیا جائے گا۔ آپ کی خاطر جمع رہے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔

اسد اللہ

(۲۱)

واہ، کیا خوبی قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی۔ یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے۔ اور پاؤں میں چوٹ لگی ہے سنو صاحب! یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلا وا بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنہ ہو گئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہو گی بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرتے ہیں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا تھا۔ پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرز تحریر سے فراوانی محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ ان کو اپنے پاس ہی تصور فرمائیے۔ بابو ہرگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے، جو آپ کے خط میں ان کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ بہم جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے ان کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے۔ اب بندگی سلام کیا ضرور!

ہاں صاحب، یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر "اہلی کے محلے" کا پتہ لکھتے ہو۔ میں "بلی ماروں" میں رہتا ہوں اہلی

کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا اب بلی ماروں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔' املی کا محلہ' کہاں اور ہیں کہاں؟

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے میں بلکہ اپنے کام کو۔ بہر صورت اب آگئے ہوں گے۔ میرا سلام کہیے گا اور ابھی خیر و عافیت کے ساتھ ان کی معاودت کی خبر لکھیے گا ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تامل رہے گا۔

'نظر شگفتن' و 'گوش شگفتن' ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو۔

نظارہ راز خون دلم گل در آستیں   خوش مگو، بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ "ز چمن از چشم چکیدن" شگفتنِ گوش و نظر کے مانند غرابت رکھتا ہے یہ 'خوں فشانی چشم' کا استعارہ ہے اور 'خوں فشانی' صفت چشم ہو سکتی ہے اگر نظر کا خوش ہونا اور کان کا شاد ہونا جائز ہوتا، تو ہم اس کا استعارہ یہ شگفتگی کر لیتے۔ خوش ہونا، جب صفت چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں!

یاد رہے یہ نکات سوائے تمہارے اور کو میں نہیں بتاتا۔ میری بات کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں۔ مگر ہاں ایسی تکرار جیسی 'بیش' اور 'بیشتر' کے باب میں کی تھی ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صحیح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھونگا، تم کو اس کے لکھنے سے کیوں منع کروں گا؟

اے صد ہزار رازِ نہاں اندریں سخن   گرم سخن توئی، نگہت کم سخن مباد
ہرچہ با نفسِ خود کنم زیدی   نیکیش نام می توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں۔ رہنے دو۔

مہر تا کامیم سلامت باد   کام را کام می توانم کرد

میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کے معنی کیا ہیں! کام، کو، کام، سب کر سکتے ہیں۔
اس میں لطف کیا ہے؟

زتر کتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز　　　زسبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے۔ تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے یہ عیب ہے۔ اس کی کون پیروی کرے گا! حزیں تو آدمی تھا۔ یہ مصرع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی تمھارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اس میں تو "مکنید" متمم معنی ہے۔ "مکنید" زاید نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اگر فارسی رہنے دو تو، اور اگر ہندی کرو تو، مصرع مہمل اور بے معنی ہے۔

چہ گل چہ لالہ چہ نسریں چہ نسترن مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا مونیا، کیا چنبیا نہ کرو، زنہار نہ کرو یعنی کیا نہ کرو؟ اب جب تمہیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو تب کوئی جانے، ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ "ذکر نہ کرو" اسے تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ کہ ذکر نہ کرو حضرت! "ذکر" مضاف کیونکر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف! کہو گے کہ "ذکر" کا لفظ نہیں، "بیان" کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ بیان کا لفظ رستوں سے، اور زنجیروں سے ان چاروں لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ کہو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں۔ مہمل محض ہے۔

والسلام
اسد اللہ

(۴۲)

صاحب!
دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بیش"، و "بیشتر"، کا قصہ نکالا۔ غلطی ہیں

جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو۔ یائے تحتانی تین طرح پر ہے:۔
جزو کلمہ:

مصرع = ہمائے بر سرِ مرغاں از آں شرف دارد

مصرع = اے سر نامۂ نامِ تو عقلِ گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: آشنائے یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہلاؤ گے۔

'نیم گناہ'، 'نیم نگاہ'، 'نیم ناز'۔ یہ روزمرۂ اہلِ زبان ہے۔ 'نیم' بہ معنی 'اندک'، ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کا ادھواڑ اور ناز آدھا، یہ جہلات ہیں۔ ان چیزوں کا مناصفہ کیا؟ اگر تم کو 'نیم گناہ' پسند نہیں، 'تازہ گناہ' رہنے دو۔

خستہ، بستہ، تازہ، غازہ، خانہ، دانہ، آوارہ، بیچارہ، روزہ، یوزہ، ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ زرہ، گرہ، کلاہ، شاہ، آگاہ، آگہ، بیگاہ، صبحگہ، ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے تو زرہے، گرہے، کلاہے، شاہے، آگہے، آگہے، گاہے لکھ دیتے ہیں۔

غالب

(۲۳)

'دیدمست' یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمھارا میں نے تو سمجھ لیا۔ مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ "المعنیٰ فی بطن القائل" کے یہی معنیٰ ہیں۔

'چشمان پُرخمار' و 'چشمان بے حیا' ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ ان سب اشعار میں نہ عیب، نہ لطف۔

دیکھو صاحب۔ خط میں تم پھر وہی 'بیش' و 'بیشتر' کا قصہ لائے ہو۔

'چہ جرم'، و 'چہ سبب' و 'چہ گناہ' پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و صد ہزار تمنا مرا چہ جرم،

اس کی حاجت کیا ہے؟ جاناں مددے، یاراں مددے، یہ تمام غزل اسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا؟ دیکھو رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو نے دین کو نقصاں مجھ سے
باعثِ دشمنی، اے گبر و مسلماں! مجھ سے

غالبؔ کہتا ہے:

مجھ تک کب اس کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں!

یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے، تو میں ڈرتا ہوں۔ یہ جملہ سارا مقدر رہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔ مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں۔

اگر دریافتی، بر دانشت بوس   دگر غافل شدی افسوس افسوس!

روز جمعہ ۱۳۔ جنوری ۱۸۵۷ء   از   اسد اللہ

(۲۴)

بندہ پرور!

ایک مہربانی نامہ سکندرآباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا یقین ہے کہ بابو صاحب تمہارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اس خط کا جواب تمہارے پاس سے آئے گا تب تمہارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہائے، ہائے! میر تفضل حسین خاں۔ بلئے۔ ہائے۔

رفتی و مرا خبر نہ کردی　　بر بیکسیم نظر نہ کردی

یہاں یہ سنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا ان کا، ان کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بدستور نائب رہے۔

۲۳، فروری ۱۸۵۴ء　　اسد اللہ

(۲۵)

منشی صاحب!

تمہارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں، اور مزا یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنج شنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب، حرارت مزاج میں بہت ہے۔ ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی۔ اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ بابو صاحب والا مناقب کا خط تمہارے نام کا دیکھا اب اس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے۔ کیوں تکلیف کریں؟ اور اگر بہر حال ان کی مرضی ہے تو خیر۔ میں فرماں پذیر ہوں اشعار سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔ بعد اچھے ہونے کے ان کو دیکھوں گا۔ اور تم کو بھیج دوں گا۔ آتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جبرِ ثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنج شنبہ ۲، مارچ ۱۸۵۴ء　　اسد اللہ

(۲۶)

میرا اسلام پہنچے!

خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔ سابق و حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی۔ مینہ برسنے لگے، ہوائے سرد چلنے لگی، مگر دل مکدّر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔ بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا۔ اس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا۔ ان سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے ان کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل لے لیں۔ اس کے سوا اور جو کچھ تمہارے خط میں لکھا تھا وہ جواب طلب نہیں اور یوں ہی ہے جو تم سمجھے ہو۔

جولائی ۱۸۵۴ء

اسد اللہ

(۲۷)

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ، آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جاوے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔ صاحب، جہاں تقطیع میں الف نہ سمائے، وہاں کیوں لکھو؟

اسد اللہ

(۲۸)

صاحب۔

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ

جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت
درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے
تمہارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ
وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط! بعد چند
مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔
یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک
خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور میں جس
شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلّہ کا نام 'بلی ماروں کا محلّہ' ہے۔
لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈنے
کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا! کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں، تو
باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم
میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ، میں حکیم محمد حسن خان مرحوم کے مکان میں نو دس
برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں
کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبانِ
عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ
بعدِ فتح راجہ کے سپاہی آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور
یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ
نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولتمند، اہلِ حرفہ کوئی نہیں ہے۔ مفصّل حال
لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور داروگیر
میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں
شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح
دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس
فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی

خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی؟ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون، جو میرے پاس آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے! یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہرحال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

شنبہ ۵، دسمبر ۱۸۵۷ء

(۲۹)

آج سنیچر کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔ میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گے! نیک گھڑی سے خدا کرے، تمہارا روپیہ مل جائے۔

بھائی، میرا حال یہ ہے کہ دفتر شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، داروگیر

سے خفا نہ ہوں، کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بہ روے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ کہو یہ تو دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے؟ انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں، مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا۔

روز شنبہ۔ ۳۰ ام جنوری ۱۸۵۸ء۔ وقت نیم روز — غالب

(۳۰)

از عمر و دولت برخوردار باشند

بدھ کا دن تیسری فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمہارا خط رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بل، جو کچھ کہیے، وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر دونیل کے کٹڑے چلا گیا۔ سو روپے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے گئے۔ پچاس روپے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے۔ وہ بکس میں رکھ دیے۔ روپے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا، سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی بُری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چار شنبہ ۳، فروری ۱۸۵۸ء۔ وقت دوپہر

غالب

(۳۱)

صاحب!

تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا۔ تمہارے اس خط کا جواب

نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا۔ مگر کلیان کا پاؤں سوج گیا تھا، وہ چل نہیں
سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا۔ ناچار تم کو خط نہ
بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہار اچھا ہوا، تو میں تم کو آگرے میں سمجھ کر سکندر آباد
خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمرالدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا کل ان کا خط
آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرزا تفتہ ابھی یہاں نہیں آئے۔ اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو
بھیجتا ہوں۔ میرا حال بدستور ہے۔ دیکھیے، خدا کو کیا منظور ہے۔ حاکم اکبر نے
آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں۔
مگر میں مل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبرآباد
کب جاؤ گے۔ والدعا۔

جمعہ ۵ مارچ ۱۸۵۸ء — غالب

(۳۲)

جانِ من و جانانِ من۔

کل میں نے تم کو سکندرآباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔ شام کو تمھارا خط آیا۔ معلوم ہوا
کہ تم اکبرآباد پہنچے۔ خیر، وہ خط پوسٹ پیڈ گیا ہے، شاید الٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا
تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبرآباد بھیجتا ہوں پہنچنے پر جواب لکھنا۔

تقطیع رباعی کی بہت خوب! مگر خیر، ہر ایک بات کا ایک وقت ہے۔
ہم کو ہر طرح لطفِ صحبت اور لطفِ شعر اٹھا لینا! بھائی منشی نبی بخش صاحب کے
نام کا خط پڑھ کر ان کو دے دینا اور اس کا مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو
میں نے خط اور قطعہ بھیجا ہے، اس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں، بن پھول
ان کا نام ہے۔ مجھ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا
کہ اس تحریر کو پیش کیجیے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی، تو تمھیں اوپر اوپر خط لکھ
کر ان کو بھیج دیتے کہ غالب ایک فقیر گوشہ نشین اور بے گناہ محض اور واجب الرحم
ہے، اس کے حصولِ مطالب میں سعی سے دریغ نہ کرتا۔

چرخ کج رو را اگر دانیم کز یاران کیست   می تواں آورد استغنا سقا دشنا مۂ

باقی جو حال ہے، وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لوگے۔ دوبارہ لکھنا کیا ضرور؟

شنبہ ۶ مارچ ۱۸۵۸ء۔ جواب طلب۔

(۳۳)

صاحب!

تمہاری سعادتمندی کو ہزار آفریں۔ تم کو یونہی چاہیے تھا۔ لیکن میں نے ایک بات بہ طریقِ تمنا لکھی تھی، جیسا کہ عربی میں "لیتَ" اور فارسی میں "کاشکے"۔

اب تم روداد سنو۔ عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گذری اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا، یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے خط صاحب کمشنر دہلی چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کر کے بھیجدی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے یہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے۔ جو اس کو دیکھیں گے۔ بہر حال بہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

مولوی قمر الدین خاں کا کول نہ جانا اور راہ سے پھر آنا معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو زندہ اور تندرست رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی

نبی بخش صاحب کو سلام اور ان کے بچوں کو دعا کہنا۔ اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا کہ بھائی ہدایت تو اچھی ہے۔ نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط وضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے، تو غنیمت ہے۔ گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور اجنٹی وکمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا۔ صرف وہ عرضی حکم پر چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر ع

هر چه از دوست میرسد نیکوست

سنو! میرزا تفتہ اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمرالدین خان کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

جمعہ ۱۳/ مارچ ۱۸۵۸ء

(۳۴)

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا۔ اور بھائی (نبی بخش) کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی وہ تو پنسن کی فکر میں تھے۔ ظاہراً یوں مناسب۔ دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ ان کی جو مراد ہو بر لاوے ان کو میرا سلام کہہ دینا، بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا۔ مولوی قمرالدین خاں کو بھی سلام کہنا تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو بائیس جزو یہاں نو۔ بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتلانے کو رہ گیا ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا! قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یکشنبہ ۱۱/ اپریل ۱۸۵۸ء　　　غالب

(۳۵)

میرزا تفتہ

عجب اتفاق ہوا۔ پنج شنبہ کے دن ۲۲ اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا کہ اس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمہارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کار محض اور تنہا ہوں۔ پانچ پہر کا دن۔ میری بڑی دل لگی ہوئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار میں میں نے بہت حظ اٹھایا۔ جیتے رہو۔ تمہارا دم غنیمت ہے۔

بھائی کا حال مفصل لکھو۔ تپسن کے طالب ہیں یا نوکری کے۔ منشی عبداللطیف کہاں ہے اور کس طرح ہے؟ علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹنٹ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا ہنوز کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالت دیوان کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ ہے۔ چاہیے یہ بھی وہیں جاوے۔

آج تمہارے اشعار کا کاغذ پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ چار دن میں پہنچ جائے۔

یکشنبہ - ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۶)

صاحب!

۲۵ اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔ آج ۳۰ ہے یقین ہے کہ خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔ ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے، اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری خوبصورت نوجوان، وضعدار ۱۲۷۴ھ میں بیمار پڑ کر مرگیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ ایک تاریخ، اس کے مرنے کی

لکھوں ایسی کہ وہ فقط 'تاریخ' نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر متروک معہذا یہ واقعہ تمہارے حسب حال ہے۔ جو خون چکاں شعر تم نکالو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے؛ بطریق مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرع آخر میں مادہ "تاریخ" ڈال دو۔ نام اس کا برج موہن تھا اور اس کو بابو، بابو کہتے تھے۔ چنانچہ میں بحر ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو اس کو آغاز میں رہنے دو اور آیندہ اسی بحر میں اور اشعار لکھ لو، چاہو کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفی کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور 'بابو برج موہن' سوائے اس بحر کے یا بحر رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے ؎

برم چوں نام بابو برج موہن چکد خون دل ریش از لب من

نگاشتہ روز جمعہ ۔ سی ام اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۷)

بھائی!

وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی قولنج اور پھر کیا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا۔ مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارا کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے یقین تو ہے کہ آج بیٹھ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب، وہ جو میں نے ۲۲ شعر مرثیے کے لکھ کر تم کو بھیجے اس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ تمہاری

تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ
اوپر اسی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ دیا۔ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب
دست و گریبان تھے، ایک کو ایک سے ربط۔ ایک یا دو شعر اس میں سے۔
کیوں کر لیے جاتے؟ اشعار سب میرے پسند ہیے سقم ہیے عیب۔ وہ جو تم لکھتے
ہو کہ ؎

حرتِ بابو برج موہن ہیز تم

اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں مگر قافیے میں 'من' ہے۔ یہ شعر
غالب کو بُرا معلوم ہوا ہو گا۔ واللہ باللہ! جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے
خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہرحال، بات وہی ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔
یارے، اب کہیے! بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمر الدین خاں
صاحب، روزوں کے متوالے ہوش میں آئے یا نہیں؟ آج ۱۰ شوال کی ہے۔
شنبہ، عید کا بھی زمانہ گذر گیا۔ خدا کے واسطے ان کی خیر و عافیت لکھو اور یہ
عبارت بھائی صاحب کی نظرِ انور سے گذرانو۔ شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محررہ و مرسلہ دوشنبہ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء غالب

(۳۸)

کیہ ں صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا۔ یا بعد دو چار دن کے
ہو جائے گا، آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی
وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں
ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں
اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے
تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد
خطوط کی موقوف صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اس میں وہ

دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں، ایک تم کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو
سنو صاحب۔ اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا
دو خط، تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔

بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا۔ اس کا جواب بھیج
دیا گیا۔ مولوی قمر الدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں کس واسطے کہ مجھ کو مئی
میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہر حال اگر آپ آزردہ نہیں، تو جس
دن میرا خط پہنچے اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت
منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال۔ اس سے سوا گوالیار کے
فتنہ و فساد کا ماجرا، جو معلوم ہوا ہو وہ، الفاظِ مناسبِ وقت میں ضرور لکھنا۔
راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت؛ دھول پور کا رنگ، صاحبانِ عالی
شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے۔
وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشتہ شنبہ ۱۹، جون ۱۸۵۸ء غالب

(۳۹)

جیتے رہو اور خوش رہو۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ ہے کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرواز دے دیا تھا۔ گرمی
ہنگامۂ انطباعِ دیوان وغیرہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصروف
کاغذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔ مغتنمات میں سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور
نے جو 'افسانۂ عجائب' لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزا دیتا ہے۔

یاد گارِ زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے اور 'یاد رکھنا' فسانہ' کے واسطے کتنا مناسب!
منشی عبد اللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے۔

اور تہنیت میں بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو ان سے ملو، تو میرا سلام کہ کر اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے لینا۔ مولوی معنوی جب کانپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بدستور۔

ہماں پہلو۔ ہماں بستر، ہماں درد

شنبہ۔ ۲۶ جون ۱۸۵۸ء۔ روز ورود نامہ غالب

(۴۰)

آج کچھ درد مرے دل سوا ہوتا ہے رکھیو غالبؔ! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

بندہ پرور!

پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا۔ اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ میرزا حاتم علی صاحب مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھ دینا ؎

شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من ست

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے۔ اس کا نام عیش ہے تمھاری توجہ مفرط بہ طرف شعر و سخن کے تمھاری شرافت نفس اور حسن طبع کی دلیل ہے۔ اور بھائی، یہ جو تمہاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں ع

اے مرگِ ناگہاں ! تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہات سے قتل ہوئے۔ اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے ! اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۴۱)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے !

بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرے میں ہو یا نہیں! میرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا۔ یہاں سے اس کا جواب بھیجا گیا۔ وہاں سے اس کا جواب آگیا۔ میر مکرم حسین صاحب کا خط پرسوں آیا۔ دو چار دن میں اس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بدستور ہے۔

نہ نویدِ کامیابی، نہ نہیبِ نا امیدی

بھائی تمھارا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور وہ میرے خط کے جواب میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب ان کو خط

ہوں گا۔ تم اگر ملو تو ان سے کہہ دینا کہ بھائی قاسم علی خان کے شعر نے مجھ کو بڑا مزا دیا
اس اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے تھے، جو میں نے ایک ولایتی پنڈ اور ایک شالی رومال
بھائی گزا دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ
لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔

۱۸، جولائی ۱۸۵۸ء غالب

(۴۲)

مرزا تفتہ!

کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہر کارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے،
آیا اور اس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ
پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ یارے جب اس کی تحریر دیکھی تو تمھارے
ابیات کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے۔ مگر اس کے آگے کالی مہر اور
کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہر کارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوا دیجئے
اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا۔ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا
آدمی جو ڈاک گھر گیا اس کو خطوں کے بکس میں ڈال دیا۔ ڈاک کے کارپردازوں
نے غور نہ کی اور اس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔

وہ صاحب جو میرے عرفت سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں۔
یعنی منشی بھگوان پرشاد، مثل خواں، میرا اسلام قبول کریں۔

۲۸، جولائی ۱۸۵۸ء غالب

(۴۳)

میرزا تفتہ!

تمہارے اوراقِ مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں ۵ اگست کو
اور میرزا حاتم علی صاحب کی نثر شاید آغازِ اگست میں روانہ کر چکا ہوں
اس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم ہوا کہ میری خدمت مخدوم کے

مقبول طبع ہوئی یا نہیں۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں اور کس خیال میں ہیں! نہیں معلوم مولوی قمرالدین خان الٰہ آباد سے آگئے یا نہیں! اگر نہیں آئے، تو وہ وہاں کیوں متوقف ہیں! میر منشی قدیم وہاں پہنچ گئے اپنا کام کرنے لگے! یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو یہ تاکید لکھنا ہوا کہ ان تینوں باتوں کا جواب الگ الگ لکھیے اور جلد لکھیے۔ اس خط کے پہنچنے تک اغلب ہے کہ پارسل پہنچ جائے۔ اس کے پہنچنے کی بھی اطلاع دیجیے گا۔

اب ایک امر سنو! میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم میں لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام منشی ہرگوپال، منشی لفظ عربی ہے۔ نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے یعنی نہ چھدرا نہ گنجان، اوراق بے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جزو میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک اس میں کوئی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع اتنے پہ کیوں ملنے لگا! اور البتہ چاہیئے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے یقین ہے کہ پانسو، سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین آنے، چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہو گی۔ رہا کاغذ وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گی۔ حاشیے پر البتہ

ات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کر دا ور حساب
علوم کر کے مجھ کو لکھو اگر منشی قمرالدین خاں آگئے ہوں۔ تو ان کو بھی شریک
صلحت کر لو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطالب
مں کا جواب یہ سب ایک خط میں پاؤں۔ ضرور، ضرور، ضرور!

نگاشتہ و رواں داشتۂ سہ شنبہ۔ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء
جواب طلب۔ واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔

غالب

(۴۴)

ائی!

تمہارا وہ خط جس میں اوراق مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراقِ مثنوی
راقِ دستنبو کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمہارے مطالب کا جواب جدا جدا
ھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب، تم نے مرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا؟ بات اتنی تھی کہ
ہ مجھ کو لکھ بھیجئے کہ نثر آئی اور مرزا صاحب نے پسند کی۔ اب ان سے میرا
لام کہو اور یہ کہو کہ آپ کے شکر بجا لاتے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ چھاپے کے
ب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب
ؤ گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں
ے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ
ن کے جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو۔ طرز تحریر کیا
وگی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہو گا۔ جیتے رہو مہ
ں عمر دگی میں مجھ کو ہنسایا! وہ کون ملّا تھا جس نے تم کو پڑھایا:

گرچہ "عملکار" خردمند نیست "

عملکار" = "اہلکار"؟

یہ شعر شیخ سعدی کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے۔

مجز بہ خردمند مفرما عمل

یعنی "خدمت و اعمال سوائے علما اور عقلا کے اور کے تفویض نہ کر"۔ پھر خود کہتا ہے:

گرچہ عمل کارِ خردمند نیست

یعنی "اگرچہ خدمات و اشغالِ سلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطرے میں ڈالے"۔ "عمل" الگ ہے اور "کار" مضاف ہے بطرف "خردمند" کے ورنہ دوہائی خدا کی "عملکار" "اہلکار" کے معنی پر نہیں آتا۔ مگر تبتیل اور واقف یا اور یورپ کے ملکیوں کی فارسی۔

(۴۵)

صاحب!

عجب اتفاق ہے آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط جاگیر کے گاؤں کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشاپوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ قضارا جب میں نے اس کو کھولا، اسی ورق میں یہ مطلع نکلا ؎

اگر بہ گنج گہر مُلیم وا فتاد چہ باک! کفِ جوادِ ترا از برائے آں داریم

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ؟ تمھارا خط آیا۔ مجھ کو لکھنا ضرور ہوا۔ آج تمہیں دو خط بھیجے ہیں۔ ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ اور ایک اب، بارہ پر تین بجے، بیرنگ۔ اس شعر کو اب چاہو رہنے دو۔ ہائے ہائے! تم بھائی سے ملے۔ غیاث اللغات کھلوائی۔ "جواد" کا لغت دیکھا۔ مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمھارا جو یائے حال ہے۔ دستنبو اور اس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا۔ البتہ اگر تم ذکر کرتے تو وہ دونوں باب میں کچھ فرماتے اور مجھ کو دعا سلام کہ دیتے۔

چونکہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر انھوں نے کچھ نہیں کہا، تو ان کا ستم۔ اور اگر ان کا کہا تم نے نہیں لکھا، تو تمہارا کرم۔ بہر حال خوب مصرع حافظ کا تم نے یاد دلایا۔ ع

یارب، مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ یاد رہے: یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا۔ اگر دستنبو کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے۔

آخرِ روزِ دوشنبہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

(۴۶)

نورِ نظر و لختِ جگر مرزا تفتہ!

تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے۔ تم اس رقعے کو دیکھتے ہی ان کے پاس حاضر ہوتا اور جب تک وہاں رہیں تب تک حاضر ہو اکرنا اور دستنبو کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا۔ ان کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کریں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب ان کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرائش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے۔ اس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیے پر لکھ دینا۔ جہاں یہ فقرہ ہے: سنے نے، "افسر بختِ خسرو در بلندی بہ جائے رسید کہ رنج از خاکیاں نہفت۔"

جائے کہ ستارہ شوخ چشمی ورزد | افسر افسار دگر زنِ ارزن ارزد
خورشید ز اندیشۂ چادر گردش | بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

چونکہ حاشیہ معنی لغات سے بھرا ہوا ہے تو تم اس فقرے کے آگے نشان بنا کر اوپر کے

حاشیے پر رباعی لکھ دینا۔ اور حاشیہ یمین پر جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں وہاں رباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا: "افر" ، "افسار" ، "گرزن" بہ ہر دو فتحہ" جاندر گردش ۔"

نگاشتۂ ۲۸ ر اگست ۱۸۵۸ء
غالب

(۴۷)

صاحب!

عجب تماشا ہے! تمھارے کہے سے منشی شیو نرائن صاحب کو لکھا تھا۔ سو کل ان کا خط آیا تھا اور انھوں نے 'دستنبو' کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو ان کے پاس لے نہ گیا ہوگا۔ آخر تمھیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا۔ اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے امید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط کا منحصر رکھا ہے تو وہ بھی ہو چکی ہوگی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی، اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس۔ اگر یوں ہے، تو میں اس کے انطباع سے درگذرا۔ سیکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔ اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے، تو اس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا! بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو۔ خدا کے واسطے، خط جلد ی بھیجو۔ اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ 'دستنبو' تم کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔ اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گذرا ہے کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیے۔ مگر فطرت کو کیا کروں؟ ناچار لکھتا ہوں صاحب مطابق خط کے لفافے پر لکھا ہے۔

مرزا نوشہ صاحب غالب

للہ! غور کرو کہ یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے! ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول

کتاب پر بھی نہ لکھدیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اُردو یا پنج آہنگ یا 'مہر نیم روز' چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی، جو وہ میرا نام لکھ دیتے۔ تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا، صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو صرف عرف معلوم ہے۔ مگر کلکتے سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمے میں اور ملکۂ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا، پس اگر صاحبِ مطبع نے 'مرزا نوشہ صاحب غالب' لکھدیا تو میں غارت ہوگیا، کھویا گیا! میری محنت رائگاں گئی! گویا کتاب کسی اور کی ہوگئی! لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں؟

بدھ کا دن، ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء

(۴۸)

للہ الشکر تمھارا خط آیا اور دلِ سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم خط میرا اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہرحال اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھانے میں اس کی بردش دلآویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی۔ اچھا کیا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے جس محل پر کہ ان کو بتاتے ہیں، ضرور لکھوا دینا۔ میں نے جو تم کو 'میرزائی' کا خطاب دیا ہے، ان فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری امر ہے، اور میں منشی شیونرائن صاحب کو آج صبح کو لکھ چکا ہوں تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے:

اگر در دم دیگر بہ تہیب میاش ہم زند

تہیب کی جگہ 'نوائے' بنا دینا!

بہ نوائے میاش ہم زند

تہیب لفظ عربی ہے۔ اگر رہ جائے تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاکو کی

نوک سے تہذیب کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ نواب لکھ دیا جائے۔

رائے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالیٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔ صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے۔ اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان الجھی ہوئی ہے۔ اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلوتہی نہ کرو۔ اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہو گیا ہے۔ چھ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمہارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں اور تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیونکر کیا چاہیئے۔ سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں، تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھنچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری ان کی میرے کس دن کام آئے گی!

میرزا تفتہ، تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں پنجہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں۔ شہر آباد ہوتا، تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصہ مختصر، یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجیب ہے۔ دو روپیہ فی جلد اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھ روپے، آٹھ روپے، دس روپے، حد بارہ روپے میاں کو سمجھا دینا کمی کی طرف نہ کریں۔ چیز اچھی بنے۔ نہایت "۱۲" ہیں، چھ جلدیں تیار ہوں۔

منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں۔ نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ 'بہادر' کا اور

اسد اللہ خاں بہادر غالب

بھائی، تم نے اوراقِ مثنوی کی رسید نہ لکھی۔ تمھیں وہ پارسل ملا ہے۔ گر تو نہ گئے ہوں دیکھو کس لطف سے میرے نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے! اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے مگر میں اس کی عبارت کیا بتاؤں۔ صاحبِ مطبع اس امر کو اُردو میں، آخرِ کتاب لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوالو۔ منشی عبداللطیف کو یہ خط پڑھا دو۔ 'نہیب' کی جگہ 'نوا' بنا دو۔ صاحبِ مطبع کو میرا نام بتا دو۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو۔ برخوردار عبداللطیف سے مقدار روپیے کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو۔ اپنی مثنوی کی رسید لکھو۔ اپنے بہ جان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرو۔ ان سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء۔ ہنگام نیروز غالب

(۴۹)

میرزا تفتہ کو دعا پہنچے!

دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے 'نہیب' کے لفظ کو چھیل کر 'نوا' بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبداللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ ان کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں۔ ادر اُدھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جاتی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا۔ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔ بھائی، منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں، مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدر دان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟ بھائی تم نے بھی اور منشی هیو نراین صاحب نے بھی لکھا میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو:

"نامہ نگار، غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ جو میری سرگذشت کی داستان ہے اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور

میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان
مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں
اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں۔"

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور رہو، تو منشی شیونرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اب دو امر ضروری الاظہار تھے اس واسطے یہ خط لکھا ہے۔ ایک تو ارد عبارت' دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سید حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے۔ اس کا جواب اس خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ ان سے کہہ دو بلکہ یہ عبارت ان کو دکھا دو:

"بندہ پرور، نواب عطاء اللہ خاں میرے بڑے دوست اور شفیق ہیں۔ ان کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدولہ: یہ دونوں صاحب صحیح و سالم ہیں۔ شہر سے باہر دو چار کوس پر کوئی گانو ہے' وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہلِ اسلام کی آبادی کا حکم نہیں' اور ان کے مکانات قرق ہیں۔ نہ ضبط ہو گئے ہیں، نہ واگزاشت کا حکم ہے۔"

(۵۰)

شفق میرے، کرم فرما میرے!

تمھارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہو گا۔ غرض کہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن خط اور الفاظ کی صحت' سب میرے پسند، صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے۔ واللہ! بے مبالغہ کہتا ہوں۔ اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر

جیاناً اصل نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو، تو اس کو بھی صحیح کر دیں
گے۔ تم میری طرف سے ان کو سلام کہنا بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے انجام تک
ہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے
صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور دلفریب
ہو گی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنچ" کا غذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر
حکام ہیں وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیورام پوری" پر اور چاہو
نیلے کاغذ پر چھاپو۔ اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں وہ اُس
کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی "شیورام پوری" پر یا نیلے کاغذ پر۔ یہ تکلفِ محض ہے
وہاں کے حاکموں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کے نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ
گرچہ ایسا ہی صرف اور خرچ زاید پڑتا ہو تو خیر دو جلدیں اس کاغذ
اور چار جلدیں "شیورام پوری" پر ہوں۔ باقی جلدوں میں تمھیں اختیار
ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو
اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبداللطیف
کو لکھا تھا کہ ان چھ کتابوں کی کچھ تزئین اور آرائش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں، تم
نے وہ پیام ان کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبداللطیف اور مرزا حاتم
علی صاحب مہر باہم صلاح کریں۔ اور کوئی بات خیال میں آوے تو بہتر، ورنہ
ت چھ نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ، ڈیڑھ، دو دو روپیے کی لاگت
ی بنوا دینا اور اس کا روپیہ تیاری سے پہلے مجھ سے منگوا لینا۔

"آنکہ ہمہ را در یک دم بہ نوید بشو پدید آورد اگر در دم
دیگر بہ نہیبِ مباش بہم زند الخ۔"

اس میں نہیب کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے
اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی:

بہ نوائے مباش بہم زند

ضرور ضرور۔ اس کا انتظار نہ کیجو کہ جب یہاں چھاپا آئیگا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل
کتاب میں غلط رہے نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میر امیر علی صاحب کاپی
نویس کے پاس ہوں، تو ان کو یا بھائی منشی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا
اور بنوا دینا۔

روز شنبہ۔ ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء   از غالب

(۵۱)

اچھا، میرا بھائی 'نہیب' والے دو ورقے چار سو ہوں یا نو سو ہوں، سب
بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو، وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں
ساری کتاب نکمی ہو جائیگی اور میرے کمال کو دھبا لگ جائیگا۔ یہ لفظ عربی ہے۔
ہر چند مسودے میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست کرینگے۔ یہ تو صورت اور ہے۔
یعنی میں نے چھ جلدیں بارہ روپیے کی لاگت میں بکار سازی و ہنر پردازی برخوردار
منشی عبداللطیف چاہی تھیں۔ منتظر تھا کہ اب ان کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے اور روپیہ
مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہرا عبداللطیف نے پہلو تہی کیا۔ مرزا صاحب اگر کفیل تھے؛ تو
چھ جلدیں بنوا لیتے نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجائش ہے کہ دو بہت پُر تکلف اور
چار بہ نسبت اس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے تو یہ تو مدعائے دلی میرا ہے۔ مگر اطلاع
ضرور ہے۔

رائے امید سنگھ کے نام کا خط با احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں، ان کو دے
دو۔ یہ جو تم لکھتے ہو کہ 'نہیب' کا لفظ لکھ دیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع
ہو کر دو ورق تک پہنچ گیا۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منطبع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھپنے
کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے، تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں۔
میرزا تفتہ سنو: ان دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب"

کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بموجب ان کے کہنے کے برادر دینی مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لا و نعم جواب میں نہیں لکھا، تم ان سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں، آج ۱۶ ستمبر کی ہے۔ دو لمبر اخبار کے حکیم صاحب کے نام کا سرنامہ "خان چند کے کوچے" کا پتا لکھ کر روانہ کریں۔ آیندہ ہفتہ یہ ہفتہ بھیجے جائیں۔ اور حکیم احسن اللہ خان کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے اخبار مذکور میں ایک صفحہ، ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے، جس دن سے وہ اخبار شروع ہوا ہے، اس دن سے صرف اخبارِ شاہی کا صفحہ نقل کرکے ارسال کریں۔ کاتب کی اجرت اور کاغذ کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ بھائی، تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کر جواب لو اور مجھ کو اطلاع دو۔ تہیب کے تہیب سے مرا جاتا ہوں۔ اس کی درستی کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں اس کی آگہی ضرور ہے۔

پنج شنبہ۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

غالب

(۵۲)

بھائی!

مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک خط بھیج چکا ہوں۔ اب اس وقت تمھارا خط اور آیا۔ سنو صاحب، "لفظِ مبارک" میم، حا، میم، دال، اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے۔ مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خان" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا"، "مولانا"، "نواب"، اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے۔ جو چاہو، سو لکھو۔ بھائی کو کہنا: ان کے خط کا جواب صبح کو روانہ کر چکا ہوں۔

میرزا تفتہ! اب تم تزئین جلد ہائے کتاب کے باب میں برادرزادۂ سعادتمند کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہر کو اختیار ہے، جو چاہیں سو کریں۔

خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم پر بھی ظاہر کر دوں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ "آفتابِ عالمتاب" نکلتا ہے۔

اس کے مہتمم نے التزام کیا ہے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے حالات کا لکھتا ہے۔ نہیں معلوم، آغاز کس مہینے سے ہے! سو حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں۔ جب سے ہوں، وہ جو چھاپے خانے میں موجود رہتے ہیں۔ اس کی نقل کسی کاتب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئیگی، وہ بھیجی جائے گی اور ابتدائے ۱۸۵۸ء سے ان کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتے کے دو نمبر ان کو ایک لفافے میں بھیج دیئے جائیں اور پھر ہر مہینے، ہفتہ در ہفتہ ان کو لفافہ اخبار کا پہنچا کرے۔ یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں، اور اب تک آثارِ قبول ظاہر نہیں ہوئے۔ نہ لفافے حکیم صاحب کے پاس پہنچے، نہ ان صفحات کی نقل میرے پاس آئی۔ آپ کو اس میں سعی ضرور ہے۔ اور ہاں صاحب، "آفتابِ عالمتاب" کا مطبع تو "کشمیری بازار" میں ہے، مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ "مفید خلایق" کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ ان صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمایش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے۔ عند الملاقات میرا سلام کہہ کر اس کا جواب، بلکہ وہ اخبار ان سے بھجواؤ۔

جمعہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۳)

بھائی!

آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضا کے شکوہ آمیز خط جناب میرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارا ایک خط تمھارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں؟ خیر چپ ہو رہا، شکوہ محبت بڑھائیگا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجالاتا ہوں۔ یقین ہے کہ جلدیں میرے خاطر خواہ بن جائیں گی کس واسطے کہ جو آج کے خط میں انھوں نے لکھا ہے، وہ بعینہٖ میرا مکنونِ ضمیر ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہہ دینا۔ ان کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

راے امید سنگھ بہادر خوبانِ روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیاز ان
ہہ دینا۔ خدا کرے ان کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے جب وہ گوالیار کو
ریف لے جائیں، تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔ "تہذیب" کے "نوائے" بن جانے سے خاطر
ں ہو گئی۔ بھائی، میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا جن کی رو سے
پی لکی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم
ند حسین دکنی سے زیادہ ہے تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق ان اوراق
ے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ
کا ہوں، اب صرف اس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمھارا
ر مرزا صاحب کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لفافۂ اخبار پہنچ جاتا۔
تر اس وقت تک نہیں پہنچا۔ اور یہ دوپہر کا وقت ہے۔ خیر، پہنچ جائیگا۔ میں نے
ھارا خط ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ انھوں نے تمھاری راے منظور کی۔ اب
م وہ اخبار جس طرح کہ تم نے لکھا ہے، ان کے پاس بھیج دو، اور صاحب مطبع
ت اخبار اور اجرت کاتب ان کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے ان کو
طلاع دیدو۔ بس اس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دینگے۔ ہم تم واسطۂ شناسائی
ید گر ہو گئے۔ ہاں اگر احیاناً روپیے کے بھیجنے میں دیر ہو گی، تو میں کہہ کر بھجوا
ؤنگا۔ یہ البتہ میرا ذمہ ہے۔

۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۴)

ںاحب۔

قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے بھی مجھ کو دی ہے
دا ان کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں ان کو ایک مصرع کسی استاد
ا لکھ چکا ہوں۔ میں سراسر ان کا ممنونِ احسان ہوں۔ میرا سلام کہنا اور لفافۂ
خبار کے پہنچنے کی اطلاع دینا۔ میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا

جانے اس پر کیا بجوگ پڑا! ظاہرا انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیجا ہوگا۔ پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟

"شیہہ" بہ معنی صدائے اسپ، لغت فارسی ہے۔ بہ شین مکسور و یائے معروف و ہائے ہوز مفتوح و ہائے ثانی زدہ اور عربی میں اس کو "صہیل" کہتے ہیں۔ صیہہ کوئی لغت نہیں ہے، عربی نہ فارسی۔ اگر غنیمت کے کلام میں "صیہہ" لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے۔ غنیمت کا کیا گناہ؟

درخور زر روے ہر سہ گاہے شما یافت

اصل مصرع یوں ہے۔ میں نے سہو سے "خدا جانے" کیونکر لکھ دیا ہے۔ بھائی "مہر خواں" کے دو معنی ہیں۔ ایک تو خطاب، کہ جو سلاطین امرا کو دیں اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں یعنی عرف حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے جو تمہارے ذکر میں ہے پہلے "مہر خواں" کے معنی حاشیے پر چڑھ گئے ہیں۔ مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے؟ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں۔ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبانِ کونسل کی رائے ولایت آگرہ یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔ تام میرا جس طرح چاہو لکھ دو۔

بنام آں کہ او نامے ندارد ۔ بہر نامے کہ خوانی سر برآرد

شفیق یا تحقیق مولانا مہر ذرّہ بیمقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو خط لکھ چکا ہوں۔ آج یا کل پہنچ جائیگا۔ رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے۔ مگر چونکہ تحکم و کارفزائی ہے۔ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہونگی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہونگی۔ ان کی صورت یہی ٹھہرتی ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ کیوں بھائی صاحب! قرارداد اور تجویز یہی ہے۔ اور پھر سمجھا چاہیئے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں۔ نواب گورنر جنرل بہادر، لفٹنٹ گورنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی نیز کیا میری بدوضعی

کہ جناب اڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں! آخر گورنمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت
بھیجونگا۔ نہ صاحب، ایک جلد ان کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجایش نکال کر
جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں یقین ہے کہ آپ
اس رائے کو پسند فرمائینگے اور چار کی جگہ پانچ بنوائینگے۔ یہ عرض مقبول اور
یہ گستاخی، کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔

بھائی مرزا تفتہ، کل کے مرزا صاحب کے خط میں سے اس مادۂ تاریخ کا
قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا بلکہ
ایک قطعہ مولانا حقیر سے بھی لکھواؤ۔

صبح پنج شنبہ۔ سی ام ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۵)

کیوں صاحب!

اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟
نہ مرزا صاحب ہی آئے۔ نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں ایک بار منشی شیو
نرائن نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرما باقی رہا ہے۔
اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرما شرکا باقی تھا تو اب قصیدہ
چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرما قصیدے کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہوگئی ہونگی۔

تم سمجھے؟ میں تمھارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا
حاتم علی صاحب کے خطوط آنے کو تمھارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا
وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے اور اب کیا
دیر ہے اور وہاں کیا ہو رہا ہے! بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہوگی
مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؛ میں اب ان کتابوں کا آنا کب
تک تصور کروں! دسہرے میں ایک، دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی۔
کہو ... [illegible] تعطیل [illegible]

ہاں صاحب تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خان صاحب کا نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں ان کا آگرے کا آنا لکھا تھا۔ پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے وہاں تو منشی غلام غوث خاں صاحب اپنا کام بدستور کرتے ہیں۔ پھر یہ اس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؟ اس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خان صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے۔ مولوی قمرالدین خان صاحب اس کے بندوبست کو گیا چاہتے ہیں۔ اس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔

جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حسن کانوں سے سنا۔ دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا۔ مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر۔ اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملیگا۔

بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیف تصدیع چاہتا ہوں۔ یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے، تو آپ کو آرام ہو جائے۔

جناب منشی شیو نرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجئے گا اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا۔ چونکہ میرے خط کا جواب تھا اور معہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔ اس واسطے اس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ۔ زیادہ۔

نگاشتہ و رواں داشتہ صبح شنبہ ۱۶/ اکتوبر ۱۸۵۸ء

راقم غالب

(۵۶)

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندرآباد آ گئے ہو، اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے اب یہاں کب تک رہو اور آگرے کب تک جاؤ۔ پرسوں

برخوردار شیونرائن کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہورہی ہے اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آجائیں۔ خدا کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بال مکند بیصبر کے ایک خط کا جواب ہم پر قرض ہے۔ میں کیا کروں؟ اس خط میں انھوں نے اپنا سیر وسفر میں مصروف ہونا لکھا تھا۔ پس میں ان کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں تو میرا سلام کہ دینا۔ اور مطبع آگرہ سے کتابوں کا حال تو تم خود دریافت کرہی لوگے۔ میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت؟

چہارشنبہ۔ سوم نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۷)

کیوں صاحب۔

کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔ بہرحال۔

کس بشنود یا نشنود، من گفتگوے می کنم

کل جمعے کے دن ۱۲ر تاریخ نومبر کو تینتیس ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب! دل خوش ہوا۔ اور شیونرائن کو دعا دی۔ ساتت کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں وہ بھی یقین ہے کہ آج کل میں پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں منشی شیونرائن نے اندور کو واسطے راجے امید سنگھ کے، کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں!

صاحب، تم اس خط کا جواب جلد دو اور اپنے قصد کا حال لکھو سکندرآباد کب تک رہو گے؟ آگرے کب جاؤ گے۔

شنبہ ۱۳ر نومبر ۱۸۵۸ء۔ جواب طلب

(۵۸)

آج پنجشنبہ کے دن ۱۸ نومبر کو تمھارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط کے نہ پہنچنے کی دلیل یہ ہے کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا اس کا تم نے ذکر نہ لکھا صاحب تینتیس ۳۳ کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق ان کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیو نراین کی اطلاع کے کل تک میرے پاس پہنچ جائینگی۔ اور یہی منشی شیو نراین نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی اطلاع دی ہے۔

منشی نبی بخش صاحب تمھارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں۔ شاید میں تم کو لکھ بھی چکا ہوں۔ میر قاسم علی صاحب کی بدنی کا حال معلوم ہوا۔ یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلی ان دنوں میں آئے تھے۔ مجھ سے مل گئے ہیں ان کو ایک کتاب ضرور بھیج دیتا۔

بھائی۔ میں ہرگز نہیں جانتا کہ میر بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے مصنف ہوں۔ کچھ ان کے خاندان کا حال اور ان کے والد کا نام لکھو تو میں غور کروں، ورنہ میں تو اس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

پنج شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء۔ وقت دوپہر

(۵۹)

برخوردار۔

تمھارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ مقطع اب اچھا ہو گیا۔ رہنے دو۔ کل جمعہ کے دن ۱۹ نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا۔ مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں، جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے، آفتاب کی سی نمائش ہے مجھے یہ فکر کہ کہیں ان کا روپیہ تیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا میرے بھائی اس کا حال جو تم کو معلوم ہو، مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری مرضی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب، مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔

میر بادشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب تمہارے اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمہارے اور امراؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ ان کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو، تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو، تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔

میاں وہ "راست دروغ بہ گردن راوی" نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے واسطے خدا کے جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو اور "تاج گنج" کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکمِ عفوِ تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے، جو مقید ہوئے؟

محررہ صبح شنبہ۔ ۳۰، نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۰)

میرزا تفتہ۔

تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔ خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں ان کو لکھتا۔ لکھتے ہو کہ مرزا مہر کے دو چار روپیے زاید صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے ان سے استفسار کیا تھا۔ انھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں وہی بارہ روپیے صرف ہوئے ہیں۔ محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی۔ تو اس کا کیا مضائقہ۔ مجھ کو تمہارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے دو تین روپیے اٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنگا پرشاد "شاد" تخلص اپنے کو تمہارا شاگرد بتاتے ہیں مگر ریختہ کہتے ہیں کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور یہاں مکند بیخبر کی غزلیں اصلاح کو لاتے۔ وہ

دیکھ کر ان کو حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی ہے۔ میں نے اب ایک کتاب 'سادہ بے جلد' ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے۔ اور یہاں بھی ایک تماشا اور ہے۔ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ 'دستنبو' پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکرٹروں کی نذر بہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائینگے دیکھو چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں۔

تا نہالِ دوستی کے بر دہد   حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

شنبہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۱)

صاحب۔

تمہارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا۔ تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے۔ وہ حکیم سنائی کا ہے اور وہ نقل "حدیقہ" [illegible]

پسرے با پدر بزاری گفت | کہ مرا یار شو بہ ہمرہ مجفت
گفت بابا زنا کن و زن نے | پند از خلق گیرو از من نے
در زنا گر بگیر دت عسسے | بہلد کو گرفت چوں توبے
زن کنی ہر گزت رہا نکند | در تو بگزاریش چہا نکند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو، تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو، تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے ؎

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام؟ | زیں ہوسہا بگذر، یا نگذر، تی گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید؛ نہ رنجور ہوں نہ تندرست؛ نہ خوش ہوں نہ ناخوش؛ نہ مردہ نہ زندہ، جیے جاتا ہوں۔ باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہے گاہے پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئیگی، مر رہونگا، نہ شکر ہے، نہ شکایت ہے۔ جو تقریر ہے، بہ سبیل حکایت ہے بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یکشنبہ ۱۹، دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۲)

کیوں صاحب!

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو، دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے

ایک دو صبح کو اور ایک، دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس، دس، بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے، تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار۔ ۲۷، دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۶۳)

دیکھو صاحب۔ یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں یہ ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

آج تک رائے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائینگے۔ تمھارا مدعا حاصل ہو گیا ہے جس دن وہ آئے تھے اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے "تضمین اشعار گلستان" کے ان کی خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے بمبئی میں، اس کے پاس بھیج دیئے ہیں یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کریگا۔ امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا، تو ان کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار ان کے گھر گیا بھی ہوں، مگر محلے کا نام نہیں جانتا، نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجونگا۔

میر بادشاہ صاحب سے عند الملاقات میری دعا کہہ دینا

لا حول ولا قوۃ الا باللہ! لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفا تخلص، کہ میں نے آگے کبھی ان کو نہیں دیکھا تھا ناگاہ مجھ سے آ کر ملے اور تمھارا حال پوچھتے رہے میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں۔ جب میں نے ان سے کہا کہ کیا وہ تمھارے آشنا ہیں۔ انھوں نے کہا: صاحب وہ میرے بزرگ

اور استاد ہیں، میں ان کا شاگرد ہوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں
بہ سبیل ڈاک آئے تھے اور آج بہ سبیل ڈاک انبالے کو گئے۔ انبالہ ان کا وطن ہے
اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

نگاشتۂ دوشنبہ۔ ۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

(۶۴)

صاحب۔

تمہارا خط مع رقعۂ سخن فہم پہنچا۔ تمہاری خوشامد نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں کہ
تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب
میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیل ڈاک
میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا۔ کل وہاں سے آیا، آج تم کو یہ خط بھجوایا۔

محررہ و مرسلہ چہارشنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

(۶۵)

صاحب!

میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں۔ شاید نہ پہنچا ہو۔ اس واسطے از رو ے
احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور [illegible]
کے دن دلی آگیا اور چہار شنبہ کے دن تم کو خط بھیجا۔

کل آخر روز راجہ امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے۔ تمہارا خط ان کے دکھانے
کو رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ان کو دکھایا۔ پڑھ کر یہ فرمایا کہ کسی اور متدر میں قصد
اقامت نہیں ہے۔ نیا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہوں۔ آدمی بندرابن گئے ہیں، کوئی مکان
مول لینگے۔ وہاں اپنی وضع پر رہونگا۔ میرا سلام لکھنا اور یہ پیام لکھنا کہ آپ کا کلام
بمبئی تک پہنچ گیا، اب طہران کو بھی روانا ہو جائے گا۔

سوادِ ہند گرفتی بہ نظمِ تو دلفتہ بیا کہ نوبتِ شیراز و وقتِ تبریز است

صبح یک شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء

(۶۶)

صاحب ۔

تم اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں۔ کل تمھارا خط شام کو آیا، آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھ کو آئے۔ جانتے ان کی بلا کہ "بلی ماروں کا محلہ" کیا چیز ہے۔ وہ تو بہ نسبت میرے بہت بڑے آدمی ہیں۔ سیکڑوں خط انگریزی ہر روز اُن کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھر ان کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی سے کہا کہ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس کا کیا جواب لکھوں۔ محلے کا پتہ آپ ہی لکھ بھیجیے۔ سو میں پہلے امرِ واقعی تم کو لکھ کر تمھاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ ان کے مکان کا پتہ:

"بلی ماروں کا محلہ، دشنوں کا کوچہ"

'دستنبو' کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری اُن سے منگوائی۔ پھر ان کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو انھیں کے ہاتھوں وہیں سے بھجوائیں۔ اور اس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے 'سردھنے' کو بھجوائیں غرض اس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے لے چکا ہوں۔ مگر نقد۔ ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم، سہل طور پر ان کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی کتابیں منگوائی ہیں اور نقد منگوائی ہیں یا قرض اور جو وہ لکھیں، مجھ کو لکھ بھیجنا۔

شنبہ ۱۹، فروری ۱۸۵۹ء

غالب

(۶۷)

صاحب۔

تمہارا خط آیا۔ دل خوش ہوا۔ تمہاری تحریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم کو آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسالِ قیمت منظور ہے۔ چنانچہ حق التصنیف تم نے لکھا ہے۔ بھائی، کیا میں تم کو جھوٹ لکھوں گا؟ اور شیونراین نے اگر ذکر ارسالِ قیمت کا نہیں لکھا تو ریہی تو نہیں لکھا کہ بے ارسالِ قیمت منگوائی ہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم، شیونراین سے اتنا پوچھو کہ اس پچاس جلد کے بعد کے جلدیں غالب نے اور منگوائیں؛ اور قیمت بھیج کر منگوائیں، یا قیمت اس سے لینی ہے۔ دیکھو، میں نے قسم لکھی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔ راے امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے ان دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی۔ جو تمہارے خط کا ذکر آتا یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر "دستوں کا کوچہ" نہ ملیگا، تو وہ خط تیرے پاس آ جائیگا، سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب، تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچیگا۔

(۶۸)

اجی مرزا تفتہ۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمہارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے ان کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ، ۲۷، فروری ۱۸۵۹ء   غالب

(۶۹)

کیوں مرزا تفتہ۔ تم بے وفا، یا میں گناہگار۔ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو! ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے۔ تقریباً تمہارا ذکر درمیان آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں، یا سکندرآباد۔ اگر کول بھیجوں، تو مسکن کا پتہ کیا لکھوں؟ بہرحال سکندرآباد بھیجتا ہوں۔ خدا کرے

پہنچ جائے! تمہارا دیوان بہ طریقِ پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجہ امید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھجوا دیا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبرآباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہرحال اس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی تم سیاح آدمی ہو۔ جہاں جایا کرو مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ "میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ' وہاں سے خط لکھو۔ تمہارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے!

محررۂ یکشنبہ ۲۷، مارچ ۱۸۵۹ء غالب

(۷۰)

یکشنبہ۔ سوم ذی القعدہ ۱۲۷۵ھ و پنجم جون سالِ حال (۱۸۵۹ء)

صاحب،

آج تمہارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمہاری ناسازیِ طبع سن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ و تندرست اور خوش رکھے۔ اوراقِ مثنوی بھیجے ہوئے بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالب علم اور رمّال کی تھی، واقعہ بلند شہر کا اور وہ اوراق میں نے بیرنگ پاکٹ نہیں بھیجے۔ خط میں لپیٹ کر، چونکہ خط ڈبل تھا۔ دو ٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے، تو اس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔ قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پانچ سات دن ہوئے ہوں گے۔ منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر ان کا "تاج گنج"؛ وہ خود مع بعض متعلقین آگرے۔ ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط ان کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا۔ اب ناچار برخوردار منشی شیو نرائن سے ان کا حال پوچھوں گا۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ راے امید سنگھ سے خط کی امید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرے جاؤ گے اور وہاں ہونگے تو ملاقات ہو جائیگی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ از روے قیاس کہہ سکتا ہوں کہ آگرے یا بندرابن کبھی کہیں سے ان کا کوئی خط مجھ کو آیا ہو، تو میں گنہگار۔

غالب

(۷۱)

صاحب!

ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے۔ میں ان کو دیکھ کر خوش ہوا۔ وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے۔ تمھارا حال سن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں! نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں۔ خیر،

ہر آنچہ ساقیِ ما ریخت، عینِ الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجہ امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ بساون کی گلی جو حکیموں کی گلی کے قریب ہے، جوزن صاحب کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اس کے قریب کی زمینِ افتادہ بھی خریدی ہے اور اس کو ہموار رہے ہیں۔ تمھارا میں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط ان کا آیا تھا، اس کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پھر ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ بہر حال میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں باز دید کو نہیں گیا۔ شاید وہ آج گئے ہوں، یا جاویں۔ پھر اکبر آباد کو جائینگے۔ میں آج آدمی ان کے پاس بھیجونگا۔

کل مرزا حاتم علی مہر کا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا مرزا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ بھائی ان کو خط لکھ بھیجو۔

محررۂ ۱۷ جون ۱۸۵۹ء

(۷۲)

صاحب!

ایک خط تمھارا سکندرآباد سے آیا۔ اس میں مندرج تھا کہ میں میرٹھ جاؤنگا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا اور آیا۔ اس میں مندرج کہ پہلی جولائی کو جاؤنگا۔ اور تجھ

ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا کہ ۲۰ر جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اس دس دن میں کوئی پارسل، کوئی پم فلٹ پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔ آخری پم فلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا کہ جس میں ایک مثنوی بلند شہر کے واقع کی تھی کہ ایک لڑکا مر گیا "اس کی ارتھی پھکتی رہی"؛ اس کا عاشق سامنے کھڑا جلتا رہا۔ سوان دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر ۲۰ر جون سے آگے کا ہے۔ بہر تقدیر بعد اس پارسل کے کوئی اور پارسل میرے پاس نہیں آیا۔ اصلاحی کاغذ ہر طرف کے عموماً اور تمھارے خصوصاً دو دن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھ تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر قرض ہے۔ یا تو وہ نہ پہنچا، یا تم نے اس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میر بادشاہ کا دلّی آنا اور ان کا مجھ سے ملنا اور تمھارا ذکر مجھ میں اور ان میں ہوتا، معہذا راجہ امید سنگھ کا دلّی میں آنا اور بے خبر میرے گھر آجانا اور تمھارا ان سے ذکر ہونا اور ان کا یہ کہنا کہ ان کا کل ایک خط میرے پاس آیا تھا۔ سو میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا تھا۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا، یا نہیں پہنچا۔ تمھارا وہ پارسل جس کو تم اب مانگتے [illegible] میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چارشنبہ۔ ۲۹، جون ۱۸۵۹ء۔ وقت نیمروز — غالب

(۷۳)

میاں۔

تمھارے انتقالات ذہنی نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدردان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ

تھوڑی سی راحت درکار ہے، اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا! اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جئے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یارِ جانی! ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اس پایہ پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں؛ عالمِ بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں، وہاں تمام عالم، بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں، اور جس سے جو معاملہ ہے اسکو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہینگے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم تم کو ہوگا۔ قطعات تاریخ اگر کیوں کر بھیجوں، پھر تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

"خالقِ معنی" بہ معنی "معنی آفریں" صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح "اللہ" میں مشدّد لام، کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے "الٰہ" "الٰہی" میں الفِ ممدود کو دوسرا الف کیونکر سمجھیں! قیاس کام نہیں آتا، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ "الٰہی" میں جب اور کسی نے دو الف نہیں مانے، تو ہم کیونکر مانیں؟

"دویم" بر وزن "جویم" غلط۔ "دوم" ہے بغیر تحتانی۔ یالفرض تحتانی بھی لکھیں، تو "دُوم" پڑھینگے، اگرچہ لکھیں گے دویم۔ واو کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں "دوئی" درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثل "زمی" بہ حذفِ نون بلکہ بہ طریقِ قلبِ بعض "دویم" کا "دوئی" ہو گیا۔ کنوئے کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخِ وفات کا اور مادہ سوچیں واسطے کہ جب "الٰہی" میں سے

ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائیگا۔ والدعا۔

روز دو دو شنبہ بلکہ وقت و رود نامہ۔ بعد خواندن نوشتہ شد۔ یک شنبہ

از غالبؔ

(۷۴)

بھائی۔

تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا ہے

یہ ہند آمدندے از ایراں دیار

"آمدند" کی جگہ "آمدندے" بہ صیغۂ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا۔

رسیدند در ہند ز ایراں دیار

اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا۔ پھر "رسیدند در ہند" بیجا، تمھارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔

صاحب۔ "سنبلستان" سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ "رخ" کو "گل"، "زلف" کو "سنبل" فرض کرتے ہیں۔ "سنبلستان" میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتہ کا دن، تیسرے پہر کا وقت ہے، میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاترس کے منصف اور دلّی کے نامنصف ہیں۔

روز شنبہ۔ ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ آخر روز

از غالبؔ

(۷۵)

صاحب۔

تمھارا خط آیا۔ حال معلوم ہوا۔

جہانیان ز تو برگشتہ اند اگر غالبؔ
تراچہ باک ؟ خدائے کہ داشتی داری

خدا کے واسطے! میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں ان کو حکم "کراچی بتدریج" جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھئے کیا ہو! حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں

تو بیکسی و غریبی، تراکمی پرسد!

نہ جزا، نہ سزا، نہ تفریں، نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تم کو میرے سر کی قسم یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سنی۔ مجھے اس کے معلوم ہونے سے مزا ملیگا۔

شنبہ ۵، نومبر ۱۸۵۹ء غالبؔ

(۷۶)

میری جان۔

کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہؔ و غالبؔ کیوں کر بن جائیں۔

ہر یکے را بہر کارے ساختند

انت متا، سوتمتا، مصری میٹھی، نمک سلونا، کبھی کسی شے کا مزا نہ بدلیگا۔ اب جو میں اس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھیگا کہ غالب کہا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اس سے کیا رسم و راہ ہے۔ بے شبہہ جانیگا کہ تفتہ نے لکھا ہوگا۔ میں اس کی نظر میں سبک ہو جاؤنگا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائیگا۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے۔ بندہ پرور، میں تو بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی

وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اس شخص سے حسن برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔ از راہ حسن اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے؟ زین العابدین خاں، عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اس کی سالی کا بیٹا، اس کو جو چاہو، سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب ادھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اس کا لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔ تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمھارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہ، تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومہ جمعہ۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۷۷)

بھائی!

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنج شنبہ ۱۹ کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج پنج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خان کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ بھیجا۔ کل شاہجہانپور، پرسوں گڑھ مکتیسر ہونگا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رامپور جاؤنگا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھونگا۔

مرقومہ چاشت گاہ شنبہ۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء

راقم غالب

(۷۸)

صاحب۔

تمھارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رامپور پہنچے

یقین ہے کہ رامپور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے ہونگے سوائے
ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسائے
مزاج روزگار کہتے ہو، خود اس میں اُس سے کیا کم ہو! پہلے تو یہ بتاؤ کہ رامپور
میں مجھے کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں
میں! ان کا مسکن میرے مسکن سے دور۔ پھر دردولت رئیس کہاں اور میں
کہاں! چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ
مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا
ہوں۔ برحسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا
ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام۔ محلے کی
اور عرف کی حاجت نہیں۔ بلکہ دردولت اور مولوی صاحب کے نشان سے
شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابق
واقع و مناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی، تم کو بلا لونگا۔

غالب [۱۸۶۰ء]

(۷۹)

میری جان۔

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ
جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرط اقامت بلا لونگا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر
میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمھارے نہ رہونگا، نہ رہونگا، زنہار نہ
رہونگا۔ منشی بال مکند بیصبر کا خط بلند شہر سے دلی اور دلی سے رامپور پہنچا
تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا، تو یہاں سے؛ اور اگر دلی چلا گیا؛ تو وہاں
سے اصلاح دے کر ان کے اشعار بھیج دونگا۔ بیصبر کو اب کی بار مہینا بھر صبر
چاہیئے۔ وہ لفافہ بدستور رکھا ہوا ہے۔ ازبسکہ یہاں کے حضرات مہربانی
فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصت مشاہدۂ اوراق نہیں ملی۔ تم

اسی رقعے کو ان کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ۔ ۱۴ ، فروری ۱۸۶۰ء   غالب

(۸۰)

برخوردار سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ۔

اس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار کا نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹننٹ گورنر بہادر مرادآباد اور وہاں سے رامپور آئینگے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہریگا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہتا ہوا، تو فوراً تم کو بلا لونگا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں۔ وہ باہم بسر ہو جائیں۔

یکم مارچ ۱۸۶۰ء   والدعا
راقم غالب

(۸۱)

مرزا تفتہ !

اس عزدگی میں مجھ کو ہنساتا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی تضمین گلستاں چھپوا کر کیا فائدہ اٹھایا ہے جو انطباع "سنبلستان" سے نفع اٹھاؤ گے؟ روپیہ جمع رہتے دو۔ آمد اچھی چیز ہے، اگرچہ قلیل ہو۔ اور اگر روپیہ لینا منظور ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہو گا۔ اگر اچیا تا ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اس کو مدت چاہیئے۔ "رستخیز بے جا" ہو چکا۔ اب ہو تو "رستخیز" ہو یعنی قیامت اور اس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہو گی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی "رستخیز" کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمالِ فتنہ سال آئندہ پر رہا، سو بھی تو ہوم۔

میاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا

ہوں۔ تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا
قول ہے کہ یہ شخص والیِ رامپور کا استاد تھا اور وہاں گیا تھا اگر نواب نے کچھ
سلوک نہ کیا ہوگا تو بھی پانچ ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے
نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ
لیا تھا، دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا۔ لفٹننٹ گورنر الٰہ آباد جو رامپور آئے
دوران کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے
کہا کہ اگر ہماری خشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے یہ طرف
کر دیا۔ یہ سب تو سُن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر
تیس بتیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔
آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ
بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرطِ
حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں
رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء   غالب

(۸۲)

مرزا تفتہ۔

ایک امرِ عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجبِ
نشاطِ مفرط ہوگا۔ میں اجرائے پنشن سرکارِ انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے
وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم
نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔ گورنمنٹ
نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میرے پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور
وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ
یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے، پچھلے روپیے کے

باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۶، اپریل ۱۸۶۰ء　　　　غالب

(۸۳)

شنبہ ہشتم مئی ۱۸۶۰ء - ہنگام نیروز -

بھائی -

آج اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زرِ سالہ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے۔ سات سو پچاس روپیہ سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوتے۔ سو روپے مجھے مد خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپئے۔ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اس کا قرضدارِ قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار لایا اس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کروایا۔ گیارہ سو کئی روپیے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے اصل میں۔ یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دیدو، پانسو سات روپیے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے، نو سو باقی رہے۔ آدھے تو لے، آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوتھی کو وہ روپیہ لایا ہے۔ کل تک قصّہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا، دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں۔ ہفتے بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائیگا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن بیرات سے پھر کر آؤ، اسی دن اپنے ورودِ مسعود کی خبر دینا

والدعا -　　　　غالب

(۸۴)

برخوردار مرزا تفتہ -

دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی

ستو۔ آخر جون میں صدرِ پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنشن داران قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بہ طریق ششماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا۔ تا راہپور کی آمد مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا؛ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائیگی۔ ے

رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک	خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات	اور چھماہی ہو سال میں دو بار

دس گیارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا کیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیے یک مشت دیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بید رد میں مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول۔ اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گذرتا تھا کہ کٹ گھرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گذریں۔ دو شنبہ ۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا۔ وہاں جا رہا۔ جی بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے اور یہ خوبی کہ محلہ وہی "بلی ماروں" کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط لال کنوے کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہرحال تم وہی دلی، بلی ماروں کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمھارے اور ایک مسودہ بیغیر کا یہ تین کاغذ در پیش ہیں۔ دو ایک دن میں بعدِ اصلاح ارسال کیے جائینگے۔ خاطر خاطر جمع رہے۔

صبح جمعہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

صبح دوشنبہ۔ پنجم جمادی الاول ۱۲۷۷ھ و نوزدہم نومبر سال حال (۱۸۶۰ء)

میرزا تفتہ!

کل تمہارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔ آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط مع مسودہ میرا بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانا ہو گا۔ فنِ تاریخ کو دونِ مرتبۂ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حقِ محبت ہوتا ہے بہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا منشی قمر الدین خاں صاحب نے یہ ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے ؎

شیخ نبی بخش کہ با حسنِ خلق ... داشت مذاقِ سخن و فہم تیز
مرگِ تم پیشہ امانش نداد ... کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز
سالِ وفاتش ز پے یادگار ... با دلِ زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالبِ آشفتہ سر ... گفت مدہ طول دِ بگو "رستخیز"

۱۲۷۷

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامعِ اعداد نکال لیا کرتے ہیں بلکہ قیدِ معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیسا کہ یہ مصرع ؎

دو سالِ غرس ہر آنکہ ماند بہ بیند

انوری کے قصائد کو دیکھو۔ دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھے ہیں جس میں اعدادِ سالِ مطلوب نکل آتے ہیں؛ اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب؛ اگر تاریخِ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نا مستحسن تھا۔ قصہ مختصر۔ اگر تاریخ کی فکر موجبِ ادائے حقِ مودت ہے، تو میں حقِ دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں!

داد کا طالب غالب

(۸۶)

صاحب۔

تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔ "مراۃ الصحائف" کا تماشا دیکھا۔ "سنبلستان" کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گذر گئی ہے تھوڑی رہی۔ اچھی گذری ہے۔ اچھی گذر جائیگی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے عرفی کو کیا ہات آیا، جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے "بوستاں" سے کیا پھل پایا جو تم "سنبلستاں" سے پاؤ گے! اللہ کے سوا جو کچھ ہے، موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے، نہ قصیدہ ہے۔ لا موجود الا اللہ۔

جناب بھائی صاحب یعنی نواب مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہ دینا۔ ہمشیرہ کے پنسن کا جاری ہو جانا بہت خوشی کی بات ہے مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات برسرِ کار آوے یعنی آپ کا پنسن بھی واگذاشت ہو جاوے۔ اللہ، اللہ، اللہ!

صبح یک شنبہ۔ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

(۸۷)

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں۔ بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوب رو ہے؛ بدلباس ہے۔ بہرحال دونوں لڑکوں کو دونوں جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہوگیا۔

مرقومہ صبح سہ شنبہ ۹ اپریل ۱۸۶۱ء　　　　غالب

میاں مرزا تفتہ۔

ہزار آفریں۔ کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ، چشم بد دور، تسلسل معنی، سلاست الفاظ! ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا۔ وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گر دیدم وا ز جیب بہ داماں رفتم

پہلا مصرع تمھارا اگر اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جزو قصائد کا کہ لو۔ مگر خبردار، قصائد بہ قید ترددت کبھی نہ جمع کرنا:

صاحب! مجھے اس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے۔ سابق کا تمھارا لکھا ہوا، سب یاد ہے۔ میں نے اس کو دوست، بہ طریق طنز لکھا ہے۔ بہرحال وہ جو میں نے قاآنی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا، اس کی ماں مرے، اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔ بڑا ایرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغ کہنۂ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گذرا اور جس دن گذرا اسی دن پانچ ہزار روپے کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گذری۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار ملے تین ہزار روشن الدولہ نے کھا گئے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا اگر نہ بھیجا ہو، تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے

اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو۔ اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے، اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گذرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ تانتخ ہوں۔ اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر، ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دونگا۔ بھائی، یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مرگیا۔ اب کہو میں کیا کروں، اور ناتخ کیا کرے۔

دوشنبہ۔ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء غالب

(۸۹)

میرزا تفتہ صاحب۔

اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔

پہلے تو یہ کہ 'خنجر را' و 'گوہر را'، کو تم نے از قسم تنافر سمجھا اور اس پر اشعار اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا، مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں۔ سلیم ہے

شراب نقل نخواہد بگیر ساغر را   کہ احتیاج شکر نیست شیر مادر را

یہ غزل شاہجہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے ہند نے اس پہ غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں اڑا دو؟ ضیاء الدین احمد خان نام ہے۔ ہندی میں رخشاں تخلص، فارسی میں نیر تخلص۔ ع

ہمانا نیر رخشاں ضیاء الدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے۔ یہ نہ کہنا کہ شعر میں ممدوح کا نام ننگا لکھ جاتے ہیں۔ وہ عجب ضرورت شعر ہے۔ جس بحر میں پورا نام نہ آئے اس میں

شوق سے لکھو۔ جائز، روا، مستحسن جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے اس میں فروگذاشت کیوں کرو؟

دو شنبہ۔ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء

(۹۰)

صاحب۔

قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفریں! پھر استاد کے شعر کیوں تضمین کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزائش حسن۔ تمھارے ایک شعر کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ مقطع کلام ہو جائے۔ قصیدہ تمھارا "بر آورم"، "در آورم" کی ردیف کا سست ہے۔ اس کو ہم نے نامنظور کیا۔ مگر نظر ثانی میں جو شعر قابل رکھنے کے ہوں گے۔ وہ لکھ کر تم کو بھیج دیں گے۔ بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ آئندہ اس پائے نغز سے احتراز کرو۔

نورِ سعادت از جبہۂ قاصدم چکد

یہ کیا ترکیب ہے؟ 'جبہہ' بروزن چشمہ ہے۔ یعنی دو ہائے ہوز ہیں۔ "جبہۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی؟

ہر جا چشمۂ بود شیریں

'چشمہ' کی جگہ 'چشمۂ' لکھتے ہو یہ بات ہمیشہ یاد رہے۔ تم نے بڑے مشاق سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے۔

میاں،

برگ دنیا نہ ساز دنیش بود

یہ کوئی لغت نہیں، ایک لفظ نہیں، کہ کسی فرہنگ میں نکل آئے۔ یہ طرز تحریر ہے کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے۔ اس امر سے قطع نظر وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں۔ نہ

جوتیاں آپ لگادیں، ایک جوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔

میں "برہان" کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ "چار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں۔ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کرونگا! "برہان قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جزو کا ایک رسالہ لکھا ہے، اس کا نام "قاطع برہان" رکھا ہے۔ اب اس کے چھاپے کی فکر ہے۔ اگر یہ مدعا حاصل ہوگیا، تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دونگا۔ ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی ایک جلد بھیج دونگا۔ بہت سود مند نسخہ ہے۔

اس قصیدۂ جنرک موافق اصلاح کے اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کرکے اور جو مطالب کہ اس کاغذ پر مرقوم ہیں، ان کو حافظے کے سپرد کرکے اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدہ پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمہارا ہم کو بہت پسند آیا ہے۔

جمعہ ۔ ۴، اکتوبر ۱۸۶۱ء　　　　　غالب

(۹۱)

صاحب۔

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اس کا تمہیں صلہ دے۔ نواب مصطفیٰ خان صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آگئی یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ درایں ولا یہاں آنا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا کیا کہنا ہے! ایسا ہے اور ایسا ہے۔ میں چند روز میں وہاں آتا ہوں۔ عندالملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہونگی۔

ضیاء الدین احمد خان صاحب کا بھی مقدمہ آج کل میں فیصل ہوا چاہتا ہے۔ وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے، ان کو دیا جائیگا۔ انشاء اللہ العلی العظیم

از من فراغ بجو و بہ بیدم کن از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی "قطع نظر کردم از فراغ و نومید شدم از فراغ"۔

(۹۲)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمھارے یہاں آئے۔ ان کو میں نے تمھاری فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء کچھ تمھاری خدمت میں بھیجینگے۔ تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے، یہ کون؟ یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین خان، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۲ء میں حاضر ہونگے۔

(۹۳)

بھائی۔

"ریمیا" اور "ہیمیا" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بو علی یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ 'کیمیا' اور 'سیمیا' دو علم شریف ہیں؛ جو اشیا کی تاثیر سے تعلق رکھے وہ 'کیمیا'، اور جو اسما سے متعلق ہو وہ 'سیمیا'۔

جان غم سیمیا نخورد بجے   دل سوے کیمیا نیاورد زم

شعر بامعنی ہوگیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

زمان و زمانہ کو میں پاگل ہوں جو غلط لکھونگا۔ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں زمان و زمانہ لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں "نبرد" کا فاعل معدوم۔ 'حلقہ زا' کی زے پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصہ میں لکھا کہ نہ "حلقہ را" درست نہ "حلقہ زا" درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے۔

خیر د نے دور مرتا ہوں۔ مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلام اہلِ زبان خواہند یافت" مگر بیں یاتی کلامِ اہلِ زبان نہیں۔

گردشِ چرخ استخوان سائید

اس سے یہ بہتر ہے۔ ع

سودہ شد استخواں زگردش چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں

غالب

(۹۴)

صاحب۔

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف: ایک فارسی، ایک عربی، ہر چند اس منطق میں لغات ترکی بھی آجاتے ہیں۔ مگر کمتر۔ میں عربی کا عالم نہیں، مگر نرا جاہل بھی نہیں، بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں۔ علماء سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طالب رہتا ہوں۔ فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔ اہل پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے۔ سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں "مجود" لغت عربی ہے بہ معنی بخشش۔ "جواد" صیغہ ہے صفت مشبہ کا بے تشدید اس وزن پر صیغہ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھونگا۔ مگر جب کہ نظیری شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا، تو میں نے مانا۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا اور اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں۔ لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں

غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو نظیری کا دیوان وقتِ تحریرِ قصیدہ پیشِ نظر
ہوگا اور جو اس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا۔ اس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمھارے
اس خط کے دیکھنے سے پہلے میں یہ جانتا ہوں کہ اس زمین میں نظیری کا قصیدہ
بھی ہے۔ چہ جائے آں کہ وہ شعر۔ بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی
نہیں ہے۔

'زمان' لفظ عربی 'ازمنہ' جمع۔ دونوں طرح فارسی میں مستعمل۔
"زمانے"، "یک زمان"، 'ہر زمان'، 'دریں زماں'، 'درآں زماں'،
سب صحیح اور فصیح۔ جو اس کو غلط کہے، وہ گدھا۔ بلکہ اہلِ فارس نے مثلِ 'موج'،
'دموجہ'، یہاں بھی 'ہ' بڑھا کر "زمانہ" استعمال کیا ہے۔ "یک زمان" کو میں
نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا۔ سعدی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں
دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ
گھا گھس الو عبدالواسع ہانسوی لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے۔ اور یہ الو کا پٹھا قتیل
صفوتکدہ، شفقتکدہ، دانشترکدہ کو اور 'ہمہ عالم' و 'ہمہ جا' کو غلط کہتا ہے کیا
میں بھی ویسا ہی ہوں جو 'یک زماں' کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی
ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ للہ الحمد وللہ الشکر۔

مرقومۂ چہار شنبہ۔ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۶۲ء

(۹۵)

میرزا تفتہ۔

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ۔ تم سے
اور آزردگی! مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوستِ
صادق الولا رکھتا ہوں جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی
کون سی بات لکھو گے کہ موجبِ ملال ہو۔ رہا غمّازی کا کہنا۔ اس کا حال یہ ہے کہ

میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا۔ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مرگیا۔ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمہاری برائی کہتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔

بھائی، مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گذر گئی، لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمہاری پختہ ہوگئی۔ خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں۔ یہ کار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لونگا، جلدی کیا ہے۔ تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمہارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا متصور نہ ہونا۔ نظر ان مراتب پر، کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بال مکند بے صبر کا ایک پارسل ہے کہ اس کو بہت دن ہوئے، آج تک سر نامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمہارا کل آیا۔ آج اس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا، اس کو دیکھا لفافہ کیا۔ آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

غالب

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء

(۹۶)

میرزا تفتہ کہ پیوستہ بدل جا دارد
ہر کجا ہست خدا یا بسلامت دارش

صاحب۔

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں۔ اب جو تمہارا خط آیا، معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہگار، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی۔ معہذا

تمہارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے، اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر ایک مدت تک اپنے بچے کو آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے، تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام دیکھنے سے محروم رکھو جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بلکہ ایک نقل اس کی ضرور مجھ کو بھیجا کرو۔

(۹۷)

صاحب بندہ،

میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔ سوائے تین کاغذوں کے کوئی کاغذ تمہارا نہ نکلا۔ اور اس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف ان تینوں قصیدوں کی نہیں بتا سکتا اور وہ مقدمہ "۵۰" کا بہ اقتضائے حالاتِ زمانہ سست ہو گیا ہے، مٹ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اب میرا حال سنو:

درنومیدی بسے امید است   پایان شبِ سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے میں ناامید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگذاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گذری۔ گویا مردہ جی اٹھا۔ مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سانحہ گذرا کہ سامانِ سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں! اور طرہ یہ کہ نذرِ معمولی میری قصیدہ ہے ادھر قصیدہ سے کی فکر

ادھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔
وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کریگا۔ لیکن ان
دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں لکھیں اور
ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا، تو
انبالے سے آکر خط لکھونگا۔

روز چارشنبہ ۱۳ رمضان [۱۲۷۹ھ] ۴ مارچ ۱۸۶۳ء

(۹۸)

لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت
کرکے انبالے کا جانا موقوف کیا۔ بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت
پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہات پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہوگیا ہے
دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔

[۱۸۶۳ء]   غالب

(۹۹)

حضرت۔

پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کرکے ڈاک گھر
بھجوادیے۔ سمجھا کہ اب چند روز کو جان بچی۔ اسی دن شام کو ایک خط آپ کا
اور پہنچا۔ اس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔ اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل
لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں، وہ بیٹھے بیٹھے لکھتا ہوں
مزے کی بات یہ ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال یاد نہیں۔ اور کسی نے جو کہہ
دیا کہ غالب کے پاؤں کا ورم اچھا ہوگیا، اور اب وہ شراب دن کو بھی
پیتا ہے، تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔ بیس برس آگے یہ بات تھی
کہ ابر و باراں میں یا پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین گلاس پی لیتا
تھا اور شراب شبانہ معمولی بے مجرانہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں

ہوئیں۔ بڑے بڑے بیتہ بریے۔ پیتا ایک طرف۔ دل میں بھی خیال نہ گذرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے۔ پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گذر گیا۔ مادّہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں ان کی رائے کے مطابق کل سے ییب کا بھرنا بند ہیگا۔ وہ پکا لائیگا۔ تب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائیگی۔ تلوا زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامردِ بیدرد جھوٹا ہے تو اس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں، تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔

(۱۰۰)

حضرت۔

آپ کے سب خط پہنچے۔ سب قصیدے پہنچے۔ بعدِ اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستر برس کی عمر، کلام روحانی؛ نہ میں کہوں نہ کوئی باور کرے۔ امراض جسمانی میں کیا کلام! بائیں پاؤں میں ہیتا بھر سے ورم ہے۔ کھڑے ہوتے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعالِ دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصہ مختصر ایک قصیدہ سابق کا اور ایک کل کا آیا ہوا۔ یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں۔

جمعہ ۱۳ جولائی ۱۸۶۳ء

(۱۰۱)

میرزا تفتہ۔

یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ ہے کہ "اعم" بہ تشدید لفظ عربی ہے۔ ع

دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم است

مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسانِ عجم نے یوں بھی لکھا ہو، کاف کے اسقاط کی کیا توجیہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے ناچار، اس شعر کو نکال ڈالو۔ میں نے تمھیں قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم

کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد لکھا کرو۔ مدح بہ شرط ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور

۱۶ جولائی ۱۸۶۳ء　　　　غالب

(۱۰۲)

سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "پیروئے استادِ رنگ" کو

ں سے سمجھتا ؟

به از من نصیحت گرے بایدت　　　ندانم پس از من چہ پیش آیدت

ں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں۔ اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ
میں نے لکھا تھا کہ شدتِ مرض کا بیان مبالغۂ شاعرانہ ہے۔ اس کو بھی آپ نے سچ جانا
ر گا۔ حال آنکہ یہ دونوں کلمے از راہِ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے
ملعون جانتا ہوں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیانِ واقعی کو باور
کیا، تو میں نے تمہیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں۔ اور یہ کلمہ تمہیں میں نے جب لکھا ہے کہ
رد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اور ہات میں جنبشِ قلم ہے، جب تک موقعِ
صلاح خیال میں آ سکتا ہے، آج جو تمہارا دفتر پہنچیگا، اس کو کل روانہ کر دیا
ر دونگا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریبِ بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتوں میں پھوڑے،
اؤں میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں۔ نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا لیٹے
یٹے لکھتا ہوں۔ کل تمہارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اس کو دیکھ کر تمہیں
بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو۔ ایک
ن سے زیادہ توقف نہ کرونگا۔ قریبِ مرگ ہوں تو بلا سے !

صبح پنج شنبہ - ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء　　　　غالب

(۱۰۳)

انگشتری، اور، خاتم، دونوں ایک ہیں، تم نے خاتم بہ معنی نگیں باند

یہ غلط -

"جنسِ وفائے کس مخر" کیا ترکیب ہے؟ "جنسِ کس فخرِ وفا" البتہ درست ہے۔ نظرِ اول میں بہ سبب تکدّرِ حواس اور کثرتِ درد و ورمِ پا کے میں نے خیال نہ کیا ہوگا۔

یہ خط لکھ کر بند کر رکھا تھا کہ کل صبح روانہ کرونگا۔ چشمِ بد دور، آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ وہ برا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے۔ اس کو کتر کر یہ سطریں لکھ کر پھر بند کرتا ہوں۔

سبحان اللہ!

دیگر نتواں گفت اخص راکاعم ست ایں

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو؟ غور کرو۔ بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کروگے۔

"شرف قزوینی" کے مطلع میں "ساغرِ غم درکشیدہ ایم" و "دم درکشیدہ ایم"، دوسرے شعر میں:

"پیمانہائے زہرِ ستم درکشیدہ ایم"

درکشیدن کو ربط پیمانہ کے ساتھ ہے یا زہر کے ساتھ؟ اگر "زہر درکشیدن" جائز ہوتا تو وہ "سم" کے قافیے کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں "قلم در کشیدن" ہے۔ چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے، پانچویں میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بہ مثل "زہراب" ہوتا تو روا تھا۔ سبحان اللہ یہ عبارت:

"جائیکہ شرف قزوینی ساغر و پیمانہ زہر درکشید"

اے برادر! اشرف زہر کجا درکشید؟ بلکہ پیمانۂ زہر درکشید۔ شما ہم ساغرِ سم درکشید۔ "سم درکشیدن" کجا و "پیمانۂ غم درکشیدن" کجا۔ ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو۔ ہند میں اس کو کون سمجھیگا؟ چاہو یوں کر دو ـــ

دانی تن و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم
دریک نفس دو ساغرِ سم درکشیدہ ایم

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو۔

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بد است مرگ، و لے بد تر از گمانِ تو نیست

غالبؔ

خیر، شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو۔

میں ایسا جانتا ہوں کہ "دراعہ" بہ تشدید ہے اور وہ "درع" بروزن زرع، اور لغت ہے۔

صاحب، یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے! ایک خیال رکھا کرو کہ شعرِ اخیر میں کوئی بات ایسی آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ ادھر کے جواب کا ہرگز خیال نہ رکھو، اور ادھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے تو گھبرایا نہ کرو۔ اب میرے پاس دو قصیدے ہیں۔ ایک "لشکر بر آورم" اور ایک کل آیا ہے "بر جا ماند" و "دریا ماند"۔ خوب کہے، کہ مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اس کے نام کا تم سے منگوا چکا ہوتا اور اس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی۔ ایک دقیقہ ہے کہ لکھنے کے قابل نہیں۔ ہاں، ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ! اللہ!

(۱۰۴)

صاحب۔

"گوہر را"، "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیجو گے، ہم تمھارے

ممدوح کو دے دیں گے۔ کل تمھارا یہ قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پنج شنبہ ۱۰ ستمبر ۱۸۶۳ء کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب۔ آج میر بادشاہ آئے۔ تمھاری خیر و عافیت ان کی زبانی معلوم ہوئی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور مجھ کو تمھارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا نام کیا لکھوں؟ بات اسی قدر ہے کہ رامپور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر نہیں آئی۔ ورنہ کیا تمھارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

"دُراعہ" کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدّد ہے۔ شعرا اس کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدی کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے "جادّہ" اور "دارعہ" دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور یہ رے کی تشدید سے۔ مگر خیر "جادہ" اور "دراعہ" بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ دُرّاعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کہو کہ "دراعہ" بے تشدید بھی جائز ہے۔

غالب

(۱۰۵)

صاحب۔

کشیدن کی جگہ "درکشیدن" و "برکشیدن" بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔ برآمدن و درآمدن کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے یعنی درآید سے برآید کے معنی لیتے ہیں لیکن درکشیدن اور ہے اور "کشیدن" اور۔ میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے اور ہات کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ یاد رکھنا، اور میرے سب آدمی بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں، وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رامپور اور ایک

تم ان کی اصلاح رہ گئی۔

(۱۰۶)

لاحول ولا قوۃ! کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریق تہر درویش بہ جان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو، بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرتا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

(۱۰۷)

نورچشم غالب از خود رفتہ، مرزا الفتہ۔

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل، نہ میں کاذب۔ مگر بقول میر تقی۔ ع

اتفاقات ہیں زمانے کے

بہرحال کچھ تدبیر کی جائیگی اور ان شاء اللہ صورت وقوع جلد نظر آئیگی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا۔

یا کرم خود نماند در عالم　　　　یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعار عاشقانہ بطریق غزل کہا کرو، اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ۔ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء　　　　نجات کا طالب غالب

(۱۰۸)

سہ شنبہ، ۳۰ ربیع الثانی ۱۲۸۱ھ و ششم ستمبر ۱۸۶۴ء

صاحب۔

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اس پہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی اس کا حکم بجا لایا اور اس کو خطوں

کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ "یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے" دست آویز معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم اس جملے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خاں کے گھر کے نزدیک، عطار بھی پاس، بازار بھی قریب، ڈھائی روپے کرائے کے موجود۔ مگر مالک مکان سے یہ وعدہ ہے کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دونگا۔ بعد ایک ہفتے کے اگر تمہارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور کرایہ دار کے دینے کا اختیار ہے۔ رامپور کے باب میں مختصر کلام یہ ہے کہ نہ میں والی رامپور کو لکھ سکتا ہوں۔ نہ اس نہ لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر کبھی ریل میں بیٹھ کر آجاؤ گے تو زبانی کہ دونگا۔

(۱۰۹)

بھائی۔

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے قصائد ہی پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے۔ اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے۔ کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینھ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے۔ اور مینھ کی نئی صورت۔ دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے، اٹھنے، سونے، جاگنے، جینے مرنے کا محل، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمہاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے

نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہینگے۔ بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے۔ جونکیں لگ چکی ہیں۔ اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحبِ فراش ہوں کوئی شخص نیا۔ تکلف کی ملاقات کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔ ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ بیٹے بیٹے خط لکھتا ہوں لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ اللہ!

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء

(۱۱۰)

منشی صاحب۔

میں سال گذشتہ بیمار رہا۔ بیماری میں خدمت احباب سے مقصر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں۔ مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترکِ ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضروری۔ اگر نہ ملوں تو مختار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکروود صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ریٹینگن صاحب مقرر ہوئے۔ ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے مستعار لے کر ان کے پاس بھیج دیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے، ان کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے۔ بہ قید اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں، اور اس سواد کی صورت یہ ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں۔

اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دار جہانگیر آباد

اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں مومن خان کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

منشی ہرگوپال، معززِ قانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں۔ تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔

ظاہرا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے پھر اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا۔ پھر کچھ آپ لکھا ہوگا۔ مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمہارے خط کی رو سے مجھ کو یہ اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق، ان کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کرونگا اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اشعار ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائیگا۔ صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔ خدا کرے، کچھ تم کو فائدہ ہو جائے ورنہ بظاہر سوائے درج ہونے نام کے اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔ رینکو صاحب اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈرمنڈ صاحب پہاڑ سے آ گئے اپنا کام کرنے لگے۔ رینگن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر چلے گئے معہذا جاڑے کا موسم بڑھاپے کا عالم۔ وہاں تک جانا دشوار اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بہرحال مولوی مظہر الحق پرسوں یکشنبہ کے دن میرے پاس آئینگے۔ حال معلوم کرونگا۔ اگر میرا جانا یا لکھنا تمھاری فلاح کا موجب ہوگا تو ضرور جاؤنگا۔

روز جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۱۱)

آؤ مرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو!

یکشنبہ کو مولوی مظہر الحق آئے تھے۔ ان سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوار الحق نے بموجب حکم رینگن صاحب کے لکھا تھا پھر یک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں

دیوان تمھارے اور "نشترِ عشق" اور ایک تذکرہ اور یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی ان کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندستان میں نہ ہوگا۔ کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے۔ باقی ما بخیر شما بسلامت۔ ہاں ان کے تحت میں پندرہ بیس روپے مشاہرے کے علاقے ہیں۔ اگر تمھاری اجازت ہو تو اس امر میں ان سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں یاد نہیں آتا۔

گمانِ زیست بُوَد بر منت زبیدردی
بداست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں۔ سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیس رامپور سو روپے مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم جو اس کا کام اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے۔ عوضِ خدمتِ سابقہ میں شمار کیجیے۔ تو میں "سکر لیر" سہی ورنہ خیرات خوار ہی۔ اور اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آیا۔ فتوح مقرری تو مرتک آئی۔ اب دیکھا آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک تو نواب صاحب از راہ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔ اور بھائی تمھاری عشق چشم بد دور صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا۔ اور اگر تم خواہی نہ خواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے، تو میری جان! میرے بعد کیا کرو گے؟ میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

۱۴ رجب ۱۲۸۱ھ نجات کا طالب غالب

(۱۱۲)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ غالب کی دعاے درویشانہ قبول کریں۔

ہم تو آپ کو سکندرآباد، قانون گویوں کے محلّے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ، راجہ مان سنگھ کی حویلی، مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یا حقّہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں بھلا، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یک شنبہ ہے۔ اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے تو پنج شنبہ، جمعہ کو پہنچتا تھا۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے رینگین صاحب! کہاں رینگین صاحب! پنج شنبہ کے دن ۱۹ جنوری سنہ حال کو، وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تودیع کو نہیں گیا۔ انوارالحق گھاٹ پر نوکر ہیں۔ پندرہ روپیے مشاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ، زیادہ۔

صبح یک شنبہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء نجات کا طالب غالبؔ

(۱۱۳)

صاحب۔

واقعی "سداب" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمھارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ "قراب" کونسا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو۔ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ "قراب" اور "صراب" دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔

غالب

(۱۱۴)

حضرت۔

اس غزل میں 'پروانہ' و 'پیمانہ' و 'بت خانہ' تین قافیے اصلی ہیں ۔ 'دیوانہ' چونکہ علَم قرار پاکر لغت جُداگانہ مشخص ہوگیا ہے، اس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی غلامانہ 'و مستانہ' و 'مردانہ' و ترکانہ' و دلیرانہ' و شکرانہ" سب ناجائز و نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل بنی انھیں قوافی پر رکھی۔ "کاشانہ" و 'شانہ' و 'افسانہ' و 'جانانہ' و 'فرزانہ' یہ قافیے کیوں ترک کیے؟ یاد رہے ساری غزل میں 'مردانہ' یا 'مستانہ' یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہوگئی۔ اور غزل لکھ کر بھیجو، تا اصلاح دی جائے۔

عفو کا طالب غالب

(۱۱۵)

مرزا تفتہ، بیر شو و بیا موز۔

تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو۔ لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو۔ وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا ہے۔ کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے۔ ؏

روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔ "ناشتا" اس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اس کو "نہار منھ" تم لکھتے ہو۔ ؏

کہ عجیب ناشتا فرستادی

یعنی غذائے صبح جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: "اس نے ناشتہ بھی کیا ہے یا نہیں؟"

واقف کہتا ہے :

نے محرم قفس، نہ بدام آشنا شدیم نفریں کنیم ساعت پرواز خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے: "بُری گھڑی" اور "سبھ گھڑی"۔ اہل زبان ایسے موقع پر "طالع" لکھتے ہیں : ع

نفریں کنیم طالع پرواز خویش را

قتیل کہتا ہے ؎

یک وجب جائے بکوئے تو ز خون پاک نبود کشتہ بر کشتہ تپاں بود، دگر خاک نبود

یہاں "ہیچ نہ بود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں۔ اور پھر صاحب "برہان قاطع" کا کیا ذکر کرتے ہو۔ وہ تو لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے۔ "زیر" "زبر" "پیش" کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کاف عربی سے لکھیگا، کاف فارسی سے بھی بیان کریگا۔ جس لفظ کو "طائے حطی" سے لائیگا تائے قرشت سے بھی ضرور لکھیگا۔ فضلائے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اس کی کیا تحقیق کرتے ہیں! "نبیا" نبوت کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ "امامن" امام کے مشتقات میں سے زنہار نہیں۔ نبی بخش کا مخفف "نبیا"، امام کا متعلق اگر مذکر ہے تو "امامی" اور اگر مونث ہے تو "امامن"۔ ظغری نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے ع

وقت آں آمد کہ بینا راگ ہندی سر کند

اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں۔ مگر کیا کریں؟ "گڑ گانواں" نام ہے ایک گاؤں کا۔ اس کو کیوں کر بدلیں! ہاں "گڑ" بہ رائے قرشت کہینگے۔ لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا۔ وہ "لکنو" بغیر ہائے مخلوط کے کہینگے۔ فی زمانہ "چھاپے" کو "چاپ" بولتے ہیں۔ حزیں "جھگڑے" کو "جگر" بولتا ہے۔ ع

آں یاد کہ در ہند گر آید جگر آید

رائے ثقیلہ، ہائے مخلوط، تشدید یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب برہان قاطع
اس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے
اپنے کو رسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے۔ ع

ہر زہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بردار   اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد ورفت

اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں
فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں مدار قیاس
پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی
فرہنگ ہو، تو ہم اس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ گائے کا
بچہ بہ زور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔ یہ
جھگڑے قصے جانے دو۔ دو باتیں سنو:

ایک تو یہ کہ "ارغنون" کو بہ غین مضموم میں نے سہو سے لکھا، دراصل
"ارغنون" بہ غین مفتوح اور مخفف اس کا "ارغن" اور مبدل منہ
"ارگن" ہے۔

دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے "ایوائے" کو "ایوا" لکھا تو
اس لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

رامپور سے اپریل مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط
کا جواب آگیا۔ آئندہ جو خدا چاہے۔

یک شنبہ ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء   نجات کا طالب غالب

(۱۱۶)

صاحب۔

تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ لکھا
نہ تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں تار کے۔ ہندی و فارسی
میں مشترک۔ "بنیا" اور "امامن" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں

کیا، شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "نبیا" مخفف نبی بخش اور "امامن" متعلق
بہ امام ہے۔ مشتقات میں سے اس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ دانانِ اشتقاق
تم پر ہنسیں گے۔

"ایوائے" کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں، سب مانع ہیں! "ایوا" کے
اور سند "ایوائے" کی موسوی خان نے بہ حسب ضرورت شعر "ایوا"
لکھا ہے۔ "تہمتن" بروزن "قلم زن" ہے۔ فردوسی نے سو جگہ شاہنامے
میں "تہمتن" بہ سکون ہائے ہوز لکھا ہے۔ پس کیا اس لغت کی دو صورتیں
قرار پا گئیں؟ لاحول ولا قوۃ! لغت وہی بہ حرکتِ ہائے ہوز ہے۔

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا۔ صائب کے شعر کی حقیقت شرح
و بسط سے لکھی۔ تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "ایوا" کو الگ سمجھے، "مصیبتاہ"
کو جدا سمجھے۔ بھلا میرے قول کو "گوزشتر" سمجھتے ہو؟ تم "مصیبتاہ" یا
"حسرتاہ" برہانِ قاطع میں یا بہارِ عجم میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "وائے"
ہے کہ جب اس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے، تو تحتانی کو
حذف کر کے "وادیلا" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے وادیلا" لکھو، چاہو
"وادیلا" لکھو، چاہو آخر میں ہائے ہوز لکھو جیسا کہ "وامصیبتاہ" چاہو
بے ہائے ہوز "وامصیبتا"۔ اور یہی حال ہے حسرت، و "درد" و "اسف"
و "دریغ" کا۔ جہاں "اے" کے ساتھ "وامصیبتا" پاؤ، وہاں "اے" کو
حرفِ ندا اور منادیٰ یعنی "ہم نشیں" اور "ہمدم" کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ
لکھنے والوں نے اشعارِ قدما میں ترکیبیں دیکھیں۔ اپنا قیاس دوڑا کر اس کی
حقیقت ٹھہرائی۔ کہیں ان کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو ان میں یہ "دکنی"
ایسا کج فہم ہے کہ اس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے
تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خان کے شعر کی سند پر "ایوا" کو رہنے دو
مگر صائب کے شعر میں "ایوا" کو الگ اور "مصیبتاہ" کو جدا نہ سمجھو

تمہارے قیاس نے پھر تمھیں کہیں کا کہیں پھینکا، اور تم نے بھی کہا کہ صائب نے "ایوا" لکھا ہے۔

نجات کا طالب غالب

(۱۱۷)

دل بسے داغ دار بود و نماند — در نظرہا بہار بود و نماند

اگر "بود" کے آگے واؤ کو موقوف اور محذوف کر دو گے، تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائیگا۔

میری جان! جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے، شاید بہ سبب عبادت نہ کرنے کے قیامت میں خدا سے بھی نہ ہو گی اور بہ سبب خلاف شرع کرنے کے پھیرتے بھی نہ ہو گی۔ مگر خدا ہی جانتا ہے، جو میرا حال ہے۔

مرگ ناگاہ کا طالب غالب

(۱۱۸)

میاں، سنو۔

اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم تم اپنے مسائل دینی سے۔ بلکہ ہم تم یا وجود عدم واقفیت امور دینی سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے، دلی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں ایک بار میرے پاس نہیں آئے۔ نہ میں ان کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آں کہ ممدوح کیجیے۔ بائے انوری۔

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالب

(۱۱۹)

میرے مہربان، میری جان، میرزا تفتہ سخندان۔

تمھارا سکندر آباد اور میرے خط کا تمھارے پاس پہنچنا، تمھاری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت! نواب صاحب از روئے صورت، روحِ مجسم، اور بہ اعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے۔ اس کے پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کر دیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نول کشور کی عرضی پیش ہوئی خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریبِ شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔ بھائی مصطفیٰ خاں صاحب بہ تقریبِ تہنیت مسند نشینی و شمولِ جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے جشن یکم دسمبر سے شروع، پنجم دسمبر کو خلعت آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء وقتِ چاشت

نجات کا طالب غالبؔ

(۱۲۰)

لو صاحب۔

کھچڑی کھائی، دل بہلائے کپڑے پھاڑے، گھر کو آئے

۸ جنوری کی سال سالِ حال[1] دوشنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے

---

[1] یعنی ۱۸۶۶ء

گھر پر نازل ہوا. تمہارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا. جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی. بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہوگیا. پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا. انھوں نے تیمارداری اور غمخواری بہت کی.

کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائیگی. بغیر کھائے پیے گذارا نہ ہوگا. سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو. جس طرح ہو، اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو.

تاب لائے ہی بنیگی غالبؔ　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

اس خط کی رسید کا طالب غالبؔ

(۱۲۱)

میرزا تفتہ صاحب.

پرسوں تمہارا دوسرا خط پہنچا، تم نے پیدا کیا ہے؟ ایک فتوح کا منتظر ہوں اس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے. زمانہ فتوح کے آنے کا قریب آگیا ہے. انشاءاللہ خط میرا مع حصۂ فتوح جلد پہنچیگا. پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس ڈاک منشی کرنال یا آل کہ مجھ سے ملاقات ظاہری نہیں ہے. مگر یہ جب جیتا تھا، تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا. بعد اپنے مرنے کے میں نے اس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو. اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی ان کو اطلاع لکھو.

میں زندہ ہوں. اودھ کے اخبار میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ باعتبار ترک اصلاح نظم لکھا ہے. ورنہ زندہ ہوں. مردہ نہیں، بیمار بھی نہیں، بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار.

غالبؔ

(۱۲۲)

حضرت۔
اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں! لیکن افسوس کہ بیجا اور بیجا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک مزبلے پر سیب کا یا ہُما کا درخت اُگ جائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے دکانِ بے رونق کے خریدار ہو۔

(۱۲۳)

میرزا تفتہ کیا کہتا ہے۔ نہ ظہیر کا پتا نہ غالب کا۔ مدّاحِ شایستہ صد ہزار آفریں، اور ممدوح سزاوارِ نفریں!

○○○○○○○ ○ ○○○○○○

دیباچہ دیوان منشی ہرگوپال تفتہ

مرقومہ مرزا اسد اللہ خاں غالب

ہاں اے غالبِ تیرہ روزِ زم اختر کہ بدیں ہیچ و کسائی کہ تراست بداں مانی کہ دانی در عالمِ فرضِ محال سپندی دیدہ ایم بر آتش آرمیدہ ۔ اللہ اللہ چہ مایہ جوشِ سوداست کہ ہر نفسی کی می کشی چوں خطی کہ از نقطہ برآورند ہمرنگِ سویداست ۔ آں قلمروِ اندیشہ کہ از روانیِ خامہ و روانیِ گفتار آب و ہوا داشت دی بہمن را فروردین پرستار بود و چاشتگہش را نسیم سحری پیش کار بدیں نا خوشی و نژندی و بر آں حیراست بزور چہ افتاد کہ پیچیدن دل از دستِ تماشائیان بزد و غنچہ را چہ رو کی داد کہ بدمیدن پردۂ شکیبِ نظارگیاں نہ درد ۔ نظم ؎

آں اثرِ پردۂ سازت چہ شد ۔۔۔ زمزمۂ خارہ گدازت چہ شد
آں زجنوں پردہ کشائیت کو ۔۔۔ ولولۂ سلسلہ خائیت کو
آں نفس تا کہ کمندت کجاست ۔۔۔ واں نگہ جلوہ پسندت کجاست

گفتی کہ سوزِ غم دود از دل بر آورد و گدازِ نفس آور در زبان زد یا دلے کہ ہر آئینہ تگداخت و یا زبانی کہ ہمانا نسوخت غدرِ غمزدگی مسموع نیست بیا تا ہمیں دل بدزہرۂ الحذر نوائے را سخن نہیم و ہمیں زبانِ کثرتغزالہان لذ

سرائی را بگفتار آوریم۔ مژہ را کہ بپالودنِ خونِ دل بہ ذرد شیشہ آغشتہ تو بتو ہم
چسپیدہ بہ ریزش ایں خونِ گرم کہ دمادم در جگر جوش میزند بخیہ از ہم گسلیم و دیدہ
را ہم چناں خونابہ چکاں بیرون بہار کشائیم۔ نظم ؎

زمی جوی در بد نکو زیستی | جگر خوردن و تازہ رو زیستی
سخن چیدن و درره انداختن | دل افشردن و درچہ انداختن
رواں کردن از چشم ہموارہ خون | بشوراب شستن ز رخسارہ خون
شگفتن ز داغی کہ بر دل بود | نہفتن شراری کہ در دل بود

بہر جا بہ رہگزاری مرغزاری در نظر آوردہ و در بیابانی بخیابانی درآوردہ
اند کہ دراں تماشاگاہ تا بپویہ نیم گام زنند موج سبزہ را یلند تا کمر رسیدہ و دراں
خرامش جا تا بر خویشتن جنبند گوشۂ دستار را نگرد از گرانیِ بارِ گل خمیدہ سخن
بس کہ بہ پیچیدگی گزاردہ آمد اگرچہ دراز بود بہ کوتہی نمود از کشاکشے کہ در
نوردِ بیان رو بداد و قماشِ استعارہ کہ نقابِ عارضِ سخن است از ہم
گسست۔ ہمانا رہگزاری کہ بسبزہ زاری انگشت نما شدہ بیابانی کہ نہ خیابانی
روشناس آمدہ ہمیں غالیہ اندود سوادِ مردمک مداد دبہیں ریحاں رقم صحیفہ
مشکیں سواد است کہ در نظر داشتہ ایم و نی بینوا را بدیباچہ نگاری آں گماشتہ۔
یارب ایں سخن پیوند دانشمند در فنِ فرزانگی یگانہ و در آئینِ یگانگی
فرزانہ آسمانِ سخن را ماہِ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ کہ ایں فہرستِ گنج خانہ
زاد رقم کردۂ اوست و ایں مجموعۂ سوز و گداز فراہم آوردۂ او چہ مایہ دیدہ
و دل باہم آمیختہ باشد تا ایں نقشِ بدیع انگیختہ باشد۔ سخن عشق و عشقِ سخن
کلام حسن و حسنِ کلام را یک دگر سرشتند تا چار آخشیجِ ہستی شیوا بیانی سرانجام
یافت کہ از گرمیِ نفس و تشنگیِ جگر کہ در سخن سخن داشت بمناسبتِ برشتگیِ حسنِ
گفتار تفتہ تام یافت داد شناسان سان شناسند و اندازہ داناں دانند
کہ با آنکہ خامہ در کفِ سخن نیا از فراوانی از ورزشِ فنِ سخن لاابالی پوی و

بے پروا خرام است، سخن بہ تغزّی و خوبی و روانی در نفسِ خویش تمام است۔ آدمی
سخن اگرچہ بصورت نتیجۂ جنبشِ قلم است، امّا بمعنی از وابستگانِ سلسلۂ دم ست
لاجرم با چنیں دمِ گرم کہ ہیچ گہ دلش را از گفتار سرد ندارد، سیہ مستیِ بے سخن
تفتہ از خود رفتہ و در سخنہائی آمدہ ہم آورد ندارد۔ زیں پس از مرحلۂ سخن
گزاری کہ ہنجارِ دیباچہ نگاری است، در میگزرم و گذاردنِ حق ستایشِ
خوبیِ سخن بدیدہ وراں میگزارم۔ سخنور را سروش آموزگار و سخنش
زجہانی بہ آفریں گوئی حق گزار یاد۔

انتخابِ کلام

انتخاب از سنبلستان

بنامِ خدائے جہان آفریں ‌ ‌ ‌ زمین آفریں، آسماں آفریں

بہر ذرّہ مہر و بہر سایہ نور ‌ ‌ ‌ بہر نور را او صد تماشای طور

بہر برگ رنگ و بہر غنچہ بو ‌ ‌ ‌ پایں رنگ و بو جا بجا سو بسو

ز ماہی بود عشق او تا بماہ ‌ ‌ ‌ خدا را تواں کرد یاراں نگاہ

نہ تنہا بہ اشکِ خود است ابر غرق ‌ ‌ ‌ خروشان بود رعد و بیتاب برق

مداں قطرہ را اینکہ آید فرو ‌ ‌ ‌ زند بر زمیں سر کہ دور است ازو

دگردوں برد تر سیاہ از فراق ‌ ‌ ‌ شفق غرقِ در خون گہ از فراق

چہ صبح و چہ شام آشنای درش ‌ ‌ ‌ شب و روز گرداں بگردِ سرش

چہ ثابت چہ سیارۂ دل فروز ‌ ‌ ‌ بحیرت شب اندر گم از خود بروز

گر آب است، بو داست آتش بجاں ‌ ‌ ‌ تپاں بر سرِ خاک و ہر سو رواں

دگر خاک را بیں افتادہ است ‌ ‌ ‌ تن اندر رضا سر بسر دادہ است

کہ قندیل بالا اگر آتش است ‌ ‌ ‌ کہ ماوای بالاے تر دلکش است

چناں در ہوائے وی آشفتہ باد ‌ ‌ ‌ کہ گر گفتہ باشیم، نا گفتہ باد

بہر در مسافر بہر کو غریب ‌ ‌ ‌ نہ جای سکونش، نہ جای شکیب

چو آں چارہ را یا شد ایں مردمی ‌ ‌ ‌ از آں چارہ بو داست خود آدمی

نداند گر انداز پروردگار ‏ ندانم نش آدمی زینهار

یکے کن چہا کرده و میکند ‏ صد احسان بما کرده و میکند

چه روم و چه رے چار سو جلوه گر ‏ بچشم خدا بیں خود او جلوه گر

پری آفرید و پشه آفرید ‏ محمدؐ ازیں ہر چه باید دگر آفرید

بصلب و برحم راه معنی کشود ‏ بیک قطره آب آنچه باید نمود

چنیں کرد و بعد چنیں کردنش ‏ چه گویم چه داد از پے خوردنش

دگر ساخت از حکمت دل پذیر ‏ گہے طفل، گاہے جواں، گاه پیر

دل و دیں عطا کرد و عقل و تمیز ‏ رہد تا ز خواری شود تا عزیز

پے دیدن صنع چشم آفرید ‏ کس از نگه تا چه بایست دید

ز رحمت نصیحت شنو گوش داد ‏ اگر نشنود داد از آں گوش داد

بیکتائی خود زباں ہا کشود ‏ زبان شکر ایں خود چه خواہد نمود

ز بہر دعا دستہا راست کرد ‏ اگر بر ندارد دریغ است درد

بخشید پای از برای سفر ‏ نخیزد گراں پای خاکش بسر

سفر ہم خوش آں کز پے حج بود ‏ دگر راه بر راستاں کج بود

جبیں گر موجود بہر سجود ‏ چه شود از جبیں در سجود ار نسود

تہہ آنکه ایں جمله کرد و دگر ‏ کند ہر چه تا ید بفہم بشر

یکے اول آورد بر روی کار ‏ دگر زو برآورد چندیں ہزار

سبب تالیف کتاب

زمانیکه گشتش ده و ہفت سال ‏ ز گردوں بسی داشتم خسته حال

ز مشفق، نه ہمدم، نه امیدگاه ‏ ہماں در دل آوخ، ہماں بر لب آه

مشوش که آیا چه سازم کنوں ‏ نه دل ماندنی جان چه بازم کنوں

ولیکن نظر بر خدا ہر نفس ‏ که غیر از خدا کیست فریاد رس

گذر اتفاقاً بکول اوفتاد ‏ شوی شاد گر بشنوی رویداد

مردمان بخوبیرت دحق شناس صفای درونش برون از قیاس

مری کہ بابی کرم خود ہزار رحیمی کہ در رحم آورد بیشمار

ترمیلے کہ خوارد شرفت ہمہ جہاں لطیفی کہ لطفش بہر دم عیاں

خلیقے کہ خلقش باں آب وتاب جوادی کہ جودش ندارد حساب

از دجلہ بہ قدن از دجلہ کو بناشد کسی کو بناشد ازو

فریاد مردم بسی زود رس چناں زود رس تا چہ بوداست کس

اگر پر سیم نامش از خوش دلی خود اول ظہور است و آخر علی

خلیگا رمن بود از سالہا ز روی بہر بہر خورد من قالہا

چو بشنید ایں کو لشہرم رسید برآورد حق گوئی اورا امید

فرستاد وارث علی را بمن بمہر توی و دو داد کہن

چہ وارث علی ناز پروردہ اش بلطف دگر در ہر آوردہ اش

جگر پارۂ از جگر پارگاں بدل چارہ فرمای بے چارگاں

ہمہ انتعاش و ہمہ انبساط بنو عیکہ باید مہیا نشاط

بچشم پدر ماندہ مانند نور رہش تا دل از دیدہ بیار دور

بموسکنبل تر بہ و نسترن بلب ارغوان و بقد نارون

گلستانی از حسن پیش نظر تماشائیاں را بہار دگر

نگہ بر نمی گشت از روی او کہ میداشت دام دگر موی او

نمی باشد از تن عیاں گرچہ جاں زپیراہن او تن او عیاں

سخن عاجز اندر سخن دانیش کہ آرد سخن بر سخن دانیش

برون از قیاس و فزوں از گماں دگر ہمچہ گویم فزوں تر ازاں

بطرز پسندیدہ بعد از سلام نشست از سر صدق و کرد این کلام

کت لسک خفتہ والد دعا گفتہ است خوش گو نیت مرحبا گفتہ است

گر خوا [illegible] مدسنے دیدنت نخواہد دگر بار گر دیدنت

تو آنی که میلِ دلش سوی تست | پسندش همه خوی نیکوی تست
بیک روز صد بار یادِ تو بود | بیادِ تو ذکر و وردادِ تو بود
بغیبت ستودی ترا بارها | باستادیت کردی اقرارها
کلامت به اهلِ صفائی نمود | تو گوئی بهر یک ترائی نمود
منم آن که بشنیده ام زو بسی | که نشنیده ام بجز فلانی کسی
دل آزاده مردیکه من دانمش | خوش افتاده فردیکه من خوانمش
نه از لطفِ کس خاطرش شاد و خوش | نه از رنجشِ کس دلش رنج کش

یکی آنکه غیر از غزل مثنوی | نگفتم هنوز از طریقِ نوی
بگفتم که طی گردد این راه نیز | که هست اندرین راه بسیار چیز
دگر اینکه ماند ز راه وداد | سخن از محمد سلیمان بیاد
که او را شنیدم یکی نیک مرد | بجز نیکی آن مرد کاری نکرد
زمن هم سزد در حقش نیکوی | ازین مثنوی تا چه این شنوی
بروحِ لطیفش دعا با رسد | زخوانندگان مرحبا با رسد
چو گردم دو چارش بروزِ جزا | بگوید که ای تفته، رحمت ترا
دگر ذکرِ آنان که آرم درین | از آنان رسد هم بمن آفرین
مجزا این هر چه از مهر و کینِ کسان | هم از داد و بیدادِ اهلِ زمان
زموت و حیات و غم و عیش دهر | زپست و بلند و زمین و سپهر
زکجبازی و راستیهای خلق | زپشمینهای نو و کهنه دلق
زایمان و کفر و بهشت و سقر | زبیداری و خواب و نفع و ضرر
زهشیار و مست و نشیب و فراز | زسلطان و درویش و ناز و نیاز
رقم نی زکم دیدنی بوده است | که ننمودنی تفته بنموده است
هزار و دو صد بود و هفتاد و هفت | که شد کار ختم و دل از خویش رفت

چون این نسخه را نام از روی داد — خود استاد من سنبلستان نهاد
بهاین گشت تا بخش ای جان من — چرا ننگری سنبلستان من
دگر بابها یکه هست اندرین — نشین سازمت تا همه دل نشین
یکی باب حق بینی است و رضا — نکوکاری و زهد و فقر و فنا
دوم در ظرافت، سوم در حسد — چهارم با بلیسی مرد بد
به نیک و بد شاعران پنجمین — ششم راستی را بود با یقین
بکینه زمان هفتم آمد دگر — بجز نام خدمت هشتم مبر
به عشق و محبت نهم بوده است — دهم مسلک موت بیهوده است
ده و یک کند آگه از انتقام — ده و دو بذکر مصنف تمام
بد این جا ده و دو اما مراد — ده و سه بختم اندر آمد زیاد

حکایت از خالق عالم تبارک و تعالی

خدای جهان آفرین گفته است — به اهل جهان این گهر سفته است
که بینم نه در صورت و فعل تان — مگر در دل و نیت تان نهان
خرد بنده هر کسی کز کسی — بگیرد از او کار و خدمت بسی
دگر هیچ مزدش نه اصلا دهد — نه داد عرق ریزی او را دهد
بگوید که تو بنده هستی مرا — زبردستم و زیردستی مرا
ترا مزد بر من نباشد روا — مزن از پی مزد بر من نوا
خمش ماند و هیچ خواهد نه زر — بجز جان خود باز کاهد ز زر
منم آنکه هر بنده کارم کند — بهر کار خوش روزگارم کند
من او را دهم مزد و خوشدل کنم — طرب بیش زاندازه حاصل کنم
پس این لطف جاییکه هست از خدای — ز عفو من و ناامیدی چه جای

حکایت دیگر

بگوید خدای زمین و زمن — کنم نیکی با زلیخا که من

بود در حقیقت پی آنکہ اوست — بجان دوستم را بہر آئینہ دوست
پس آنکس کہ خود دوست با آن بود — نہ یک ذرہ اش فرق تا من بود
دریں صورتت بایدش بود دوست — بہشت و دگر ہرچہ خواہی دروست

حکایت حضرت داؤد علیہ السلام

بداؤد وحی آمد از کردگار — کہ اے بر تو جانِ ملائک نثار
بیاد شنو آنچہ فرمایمت — نشیں و نگر ہرچہ بنمایمت
کہ بشناخت ہر کو مرا یاد داشت — وزاں یاد ہر دم مرا شاد داشت
وگر قصد من کرد زاں بعد جُست — وزاں جُستنم یافت با طبع چُست
چو ام یافت از حد نگہداشت بیش — نگہداشتن بُردش آنکہ ز خویش
بنوعے کہ در کس نگاہی نہ کرد — بضبطِ نگہ غیر آہی نہ کرد
پس آں گاہ داؤد ایں عرض کرد — بصد عجز و زاری بصد سوز و درد
چہ باشد جزائے کسی کو ز دل — بیادِ تو ہر دم بود مشتغل
بفرمود آنست کانرا کہ من — کنم مبتلای خود از جان و تن
بجان و دل اورا رعایت کنم — تفقد تمامیم عنایت کنم
دریں حال شو مبتلایش کنم — صد امید یابی ہزار آرزو

حکایتِ حضرت موسیٰ علیہ السلام

شبے موسیٰ از فرط اندوہ و درد — بدرگاہِ یزداں مناجات کرد
کہ کوتہ بمن کن زباں خلق را — زکیفیتم دہ نشان خلق را
ندا آمد از غیب کای حق شناس — شناسائی تو بروں از قیاس
نہ چیزیکہ کردم پیِ خویشتن — پیِ تو کنم چوں و گوشم چہ من
ہمانا ترست از لعنت کسی — بدینا بود نکتہ چینی بسی
تواں بود از نکتہ چیں برکراں — از و ورنہ ماتے جہاں سر گراں

حکایت در ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام

بپرسید از عیسیٰ ایں راز کس   کہ اے رحمت حق بتو ہر نفس
بر آنکہ در خانہ بندش کنند   دریں رنج و محنت پسندش کنند
رسد آب و ناں از کدامیں سبیل   زبد پس چساں از کدامیں سبیل
بگفت از سبیلی کہ آید اجل   رُخ خویش اورا نماید اجل
پس ایں جا چہ گوید کس از شان حق   رسد ہر زماں نعمت از خوان حق

حکایت از محمد مصطفیٰ صلعم

روایت بود از رسول خدائے   پئی مردمان پسندیدہ رائے
کہ ایں پنج چیز است از پنج گنج   فزوں تر بسے در سرائے سپنج
شما کردنش را شوید ار کفیل   نیا رید ہیچ اندر وقال و قیل
کنم من کفالت برائے بہشت   کہ باشید در قصر ہائے بہشت
یکی آنکہ با کس زنید انچہ حرف   بود راست و آں راست ہم بس شگرف
دوم وعدہ ہرچہ باکس دہید   بایفائش از راستی دل نہید
سوم بسپرد آں امانت کہ کس   نیا رید در دادنش پیش و پس
چہارم تن خویش را از حرام   بدارید محفوظ ہر صبح و شام
جز ایں نیست پنجم کہ بکشید دست   ز تان حرام و بدی ہرچہ ہست
بجا لیک ایں وعدہ است از رسول   وز انسب پئی شبہ مطلب حصول
مر ایں پنج را چوں نہ از دل کنیم   چرا ہشت جنت نہ حاصل کنیم

ایضاً

رسول خدا گفتہ است ایں سخن   کہ شافع شوم روز محشر ز من
کسی را کزو پیر حرمت ندید   کسی را کز و طفل شفقت ندید
کسی را کہ دل بہ برادر نسوخت   کسی را کہ آزادہ مردی فروخت
خوشا آن کہ ایں چار را برگزید   دگر بے تکلف بجنت رسید

حکایت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

یکے از نظر کردہ ہائے علی ہمیشہ بدولت سرائے علی
ز نے بود در رہ پئے توب رو نظر کرد از مہر و شفقت درو
بدولت سرا آمد آنگہ فرود ادا نیز کرد آں قواعد کہ بود
دو زانو نشست از ادب سرنگوں نکو از بیروں ماندہ پیدا ز دروں
بروشن ضمیری علی یافت آں کہ در راہ دیدا و زنی را چناں
بفرمود در بزم آمد کسے کہ یار در یار از نگاہش بسے
خوش آں غیب دانی و روشن دلے رموز نہانی و روشن دلے

حکایت از ابوبکر صدیق

سخن اینکہ گویم سراسر دُر است ز حلم ابوبکر دفتر پر است
بادیک مجوسی بے سخت گفت سر آورد در جیب و یک یک شگفت
وزاں پس بفرمود کای خوش سخن فدای سخنہات صد ہمچو من
بمن ہر قدر عیبہا بودہ است ترا آگہے تا ز کجا بودہ است
ندانی تو ہرگز یکے از ہزار وے جملہ داند خداوند گار
زہے آں حلیم و زہی آں کلام تو گوئی کہ شد حلم بروی تمام

حکایت حضرت امام ابو حنیفہ

بزرگانِ دیں مجلس آراستند پیٔ بو حنیفہ ہمیں خواستند
کہ قاضی شود زانکہ دیں پروری دری عہد نبود جز او دیگری
ابا کرد کیں را نہ من در خورم برنج اندر آیا بسر چوں برم
دگر کرد انکار و گفتا پناہ نشایم من ایں کار را ہیچ گاہ
گرم صادق ایں گفتہ یاد کنید تلاش از پیش شخص دیگر کنید
وگر گفتہ ام کذب کاذب کجا بود قاضی اندر شریعت روا
رہائی غرض زیں ظرافت بیافت پس از شکر یزداں بمسجد شتافت

کہ آرد چنیں نکتۂ دل پذیر　　بر آں گروہ فلاطوں نظیر
د قاضی منم نے شرلویت شناس　　دے دانم اورا حقیقت شناس

حکایت بایزید بسطامی

شنیدم بگوش دل بایزید　　شبے از فلک ایں ندا در رسید
کہ از دل اگر خواہیم پیشم آر　　تو چیزیکہ نبود مرا زینہار
بگفتا خود آں چیست در ہیچ جائے　　کہ نبود ترا زینہار اے خدائے
بفرمود خواری و عجز و نیاز　　دگر زاری و درد و سوز و گداز

باب دوم در ظرافت

حکایت

ظریفے بہ پیش امیرے نشست　　بآں سر بلندی کہ او گشت پست
بپرسید دیگر بشوخی ازو　　کہ نام پدر چیست باز گو
امیر از غضب گھٹ کا کی قلتیاں　　چہ شد از دلت رفت چوں ہمجاں خدا
بگفتا کہ معلوم شد ای پسر　　دے نام جدہم بفرما دگر
امیر از ظریف ایں سخن چوں شنید　　خمش ماند از جبہہ اش خوی چکید

حکایت

پدر مردہ را یک حکایت شنو　　دگر مردہ خود ازاں زندہ شو
شنیدم کہ یک رند با یک امیر　　بگفتا بخواب من گوشہ گیر
پدر آمدت دوش دا از نیکوے　　بمن گفت گر بر درِ من روے
دہد پنج دینار پورِ منت　　برد رنج یکبار پورِ منت
پس ایں لحظہ پیش تو من آمدم　　پئے صحت آں سخن آمدم
زبس بود ابلہ فریب آں امیر　　بگفتا صد ابلہ بدامت اسیر
مرا ہم پدر شب بخواب آمد است　　دگر با من ایں حرف یکسر زد است

کہ گر پیش آید فلاں حیلہ گر — بزنی پنج شش کفش اورا بسر
چو رندا ز امیر ایں سخن را شنفت — بسر کوفت دست تہی را و گفت
عجب بود شیطاں عجب قلتباں — کہ با من چنیں گفت و با تو چناں

باب سوم در حسد

حکایت

یکے با من از خبث کیں داشتی — ز نامم گرہ بر جبیں داشتی
بگفتی سخن کو نخستی جگر — نمک بعد خستن فشاندی دگر
مرا دوست خواندی و دشمن بدل — بدا دوست کو دشمن من چناں
سوال مرا انچہ دادی جواب — دل و جاں بیک بار کردی کباب
نہ خوردن من جگر خوردنش — نہ بر خوردنش بہ ز بر خوردنش
من از صلح آوردمے حرف واو — ہماں فتنہ پرداز و پیکار جو
ز من ذکر بام و ازو ذکر شام — مخالف بہم صورت شام و بام
ز من وصف او و ازو غیبتم — زہی مزد خدمت زہے خدمتم
ز من شعر و او را ہجیں بر زباں — کزیں ہرزہ گوئی چہ سودے فلاں
ز من خامشی و ازو گفتگو — وزیں ماجرا ہا سخن کو بگو
دریں مہر و کیں شد بسر چند سال — وزو کیں نہ کم گشت در ہیچ حال
یکے گفت با من تو ہم آدمی — کنی چوں نہ پا کیں ذمی ہمدمی
ترا ہر قدر پاک او رنجہ کرد — نہ رنجانیدش گر دریغ است و درد
بگفتم نرنجد اگر کسی از کسی — بود گفتگو اندریں جا بسی
ز روز ازل رفت فرماں چناں — کہ من ایں چنیں باشم او آں چناں
بود طبع ہر یک بفعل خودش — خدا داند انجام نیک و بدش
بہشت و جحیم آخر از بہر کیست — مآل خود و او ندانم کہ چیست

بهشت از کسی کو نرنجد ز کس — بدین نکته ختم این حدیث است و بس

حکایت

حسد بر سه نوع است معلوم کن — گرت فهم تیز است مفهوم کن

یکی آنکه حاسد نخواهد چنان — که احسان کند کس بکس در جهان

دوم آنکه گو باشدش مال بیش — ز اهل کرم هیچ لطف و کرم

خوش است آنکه هرگز نه این هر سه را — دهی جای یا خویش بل در سه را

باب پنجم در شعر و شاعری

حکایت

شهی شاعری را بجرمی سپرد — بجلاد و هرگز غم او نخورد

زمانی که جلاد تیغی کشید — برو رنگ از روی شاعر پرید

بگفتش یکی این چه نامردی است — بآن گرم خونی چه دل سردی است

چه شد آن سر قتل خویشیت به شعر — ندانم چه بود است کیشیت به شعر

بگفتا تو گر مردی ای بوالهوس — بیا و بجایم نشین یک نفس

شه این نکته چون از زبانش شنید — بخندید و اندر کنارش کشید

ز جرمش گذشت و امانش بداد — دگر نعمت بیکرانش بداد

خوش آن شاعر و خوشتر آن قدردان — که داند کنون قدر ما شاعران

باب ششم در راستی

حکایت

یکی را بخواب اندر آمد یکی — که بیهوده بود از عدم مسلکی

پرسیدش آیا چہ حق با تو کرد — رسانیدت بجاں راحتی یا کہ درد
بگفتار مرا بر سرِ عدل داشت — وزاں عدل منت بجانم گزاشت
زمن کرد یعنی نخست ایں سوال — کہ ای من ترا دادہ فضل و کمال
کہی یاد کردے مرا بے ریا — ودیا شکرم اوردی از دل بجا
باعمالِ خود دیدم آں گہ کہ من — ندیدیم یکے زاں دو بے مکروفن
باقرار آں لب کشودم دگر — سخن راندم از راستی سربسر
بآں راستی راست شد جملہ کار — بہ بخشود بر من خداوندگار
بمن داد از لطف خلد بریں — خدا را تو ہم راستی برگزیں

باب ہشتم در مذمّت خسّت

حکایت

سخی تازہ نخلیست راحت رساں — کہ اوصافش آید نہ اندر بیاں
فدائے چناں نخل جانم بود — جزایں تا چہ دردِ زبانم بود
کہ خوابند در سایہ اس وحشیاں — ببینند در خواب باغ جناں
نشینند بر شاخہایش طیور — نشیمن کنند و بر آرند شور
کنند از وفور طرب کرمکاں — بسوراخہایش مکاں در مکاں
خورند آب گلہائے او صبح و شام — مگسہا و باشند بس شاد کام
نباتات ہر گونہ دریائے او — دمند و در آناق رنگ و چہ بو
پس ایں جملہ در ذات او دیجبست — کے گرنہ باور کنند دو ز خیست

باب نہم در عشق

حکایت عبد اللہ مبارک

شنیدم کہ عبد اللہ محو دلق — کہ او را مبارک ہمی خواند خلق

بعہد شباب از زناں با یکی — کہ بود آں یکی خود بصد با یکے
پے ہیچ من داشت دل بستگی — وزو حاصلش بود دل خستگی
شبے زیر دیوار او در رسید — خود او در نیز از غرفہ سر بر کشید
ہم ماند حرف و حکایت بسی — ز غمہاۓ ہجراں شکایت بسی
کہ تو آں زماں رخ ز من تافتی — نہ اندازهٔ عشق من یافتی
تو آگونہ ورزیدے از من حجاب — ندیدی کہ چوں بودہ ام در عذاب
ہر آئینہ از شام تا صبح ماند — ہمیں ذکر و ہر یک ہمیں قصہ خواند
کہ ناگاہ بانگ نماز سحر — ز مسجد بر آمد بذوق دگر
بدانست عبد اللہ عشق باز — سراپا نیاز و طلبگار ناز
کہ بانگ نماز عشا ہست ایں — دم خواب درویش فحماہست ایں
چو کردش نظر بود صادق سحر — ہمیداد از درد ہجراں خبر
بسے شد ملول و بسی شد حزیں — ز ناکامی خویش چیں بر جبیں
دراں حال آمد بگوشش ندا — کہ اے ماندہ از من ہمہ شب جدا
چہ کردی کہ کردی تلف وقت خویش — بعشق زنے اے نکوہیدہ کیش
گسستی ز من ساختی با زنے — زنے مرد را در جحیم افگنے
تفاوت نہ کردی تو در نور و نار — کجا بندهٔ و کو خداوندگار
ازیں حرف عبد اللہ غم زدہ — ز مرگ دل خویش ماتم زدہ
بخویش آمد و توبہ زاں عشق کرد — بعشق خدا گشت صحرا نورد
بکلی دراں عشق مشغول گشت — نہ از این و آں بلکہ از خود گذشت

حکایت

دو یار وفا پیشہ روزی بہم — کہ خوردی باآں روز زاندہ قسم
یکشتی پئے عبرہ جا داشتند — نظر بر تموج فرا داشتند
کہ ناگاہ آں کشتی از ہم شکست — دراں بحر دلہا بصد غم شکست

فتادند در ورطہ آں ہر دو یار ‏ پئے بردن جاں نماند اختیار
دراں حال ملاح خود را فگند ‏ بآب و شدش ایں وفا دل پسند
کہ آرد از آناں یکی را بدرد ‏ کشیدی ز دل آں یکی آہ سرد
گرستی و گفتی کہ ای دلپذیر ‏ مرا کن رہا دیگرے را بگیر
غرض ہر دو گشتند آنجا غریق ‏ وفا بود گوئی تو بحر عمیق

باب دہم در ذکر موت

حکایت

یکی بود خوش طبع و خوش اعتقاد ‏ نکو خوی و خرم دل و پاک زاد
بجز خوش دلی ہیچ کارش نبود ‏ تو گوئی غم اندر دیارش نبود
ہر آنکس کہ مردی بتابوت وی ‏ رسیدی و خوردی بصد ذوق می
دراں ذوق با خوشدلی ساختی ‏ چہ خوش خوش مزامیر بنواختی
وزاں پس دم از وجد حالت زدی ‏ وزاں وجد و حالت برقص آمدی
غزلہا بخوش نغمگی می سرود ‏ غم از خاطر ہر یکے می ربود
جز ایں تا چہ رانم سخن یا ز او ‏ دراں سوز بودی بسے ساز او
قضا را جگر گوشہ اش نیز مرد ‏ فلک نقش ہستی ز لوحش سترد
بدستور پیشیں ہم آمد فراز ‏ بتابوت او ہم بداں برگ و ساز
ایاغی کشید و دماغی رساند ‏ ایاغی دگر بر ایاغی رساند
ہماں نغمہ بود و ہماں سرخوشی ‏ طرب بر طرب ہم خوشی بر خوشی
غزل میسرود و قدح می کشید ‏ دعائی نمود و ثنائی شنید
دف و چنگ و بربط مہیا ہمہ ‏ سر و برگ شادی در آنجا ہمہ
بوجدش فتاد وجد صاحب دلان ‏ دگر حالتش را چہ شرح و بیان
یکی رفت و پرسید از وے ایں سخن ‏ بآہستگی کای فدائے تو من

ازیں مرگ [illegible]ل تو چونست چوں — صبور است دل یا کہ خون است خوں
بگفت ارچہ ایں تیر کردست کار — گذشتہ است از سینہ بے اختیار
دلی نگذرم از طریق کہن — تبسم کہ خندند مردم بمن
ہماں شرم دارد ہنوزم بریں — وگر نہ اجل را خورم در کمیں
بلے ایں چنیں تیر ہر کس کہ خورد — بیک دم دو صد بار بیش مُرد

باب یازدہم در انتقام

حکایت

یکے جفت کنجشک در خانۂ — بسقف اندروں داشت کاشانۂ
ہمی بگذرانید با کام دل — ہمش قوت جسم و ہم آرام دل
دراں سقف بودی یکی مار ہم — عدیلش دریں دور بسیار کم
بلا جانور خوار مردم گزاے — پُر آشوب پُر زہر قہر خداے
چو کنجشک را چو شہا خون زدے — و زو بچۂ در وجود آمدے
بخوردی دلازار خونخوار مار — جفا پیشہ ظالم ستم کار مار
دل از غصہ کنجشک را سوختے — چہا غم کشیدے چہا سوختے
بہر جزو و کل داد چوں حق تمیز — بدیں کار کرد آنچہ کنجشک نیز
کہ یک شب فتیلہ یکے از چراغ — بمنقار خود بُردہ با صد فراغ
بکاشانۂ مار بنہاد و خویش — طریق امان باز بگرفت پیش
بپائے نشست و نظر بر کشود — کہ بیند بخصمش رود تا چہ زود
بصاحب مکاں چوں شد ایں اشتباہ — کہ ناگاہ سقفش بسوزد چو کاہ
ببالا شد و سقف از ہم درید — در آنجا ہماں مار خونخوار دید
کہ بر جان کنجشک کردی ستم — بدل ساختے شکرش لا یسم
سرش کوفت با چوب و کردش ہلاک — نشاندش بخون و فگندش بخاک

برآسود گنجشک از ظلم او | بیامد بکاشانهٔ خود فرد
غرض ظالم از ظلم خود پیشتر | دهد جان بسختی رود در سقر
تو گر از سقر ترسی ای جان من | مشو ظالم و ظلم را بیخ کن
ندیدی چسان ظلم می کرد مار | بگنجشک و از دست گنجشک زار
بپاداش خود چون سلکش در رسید | بتلخی چسان زهر کلفت چشید
خوش آنانکه ترسند از انتقام | د از انتقامند آگه عوام

باب دوازدهم در ذکر مصنف

چه خوش بود وقتیکه من داشتم | پدر بر سر خویشتن داشتم
مپرس اینکه عالم چسان می گذشت | نشاطم بدل هر زمان می گذشت
گه انگشت او در کف من زناز | گه آغوش او بهر من بود باز
گهی تنگ بکشیدنش در برم | گهی دست مالیدنش بر سرم
گه از پرنیان بستر دلکشم | گه افسانها بهر خواب خوشم
گه از باغ در خانه آوردنم | گه از ذکر آدینه خوش کردنم
گهی زانچه خواندم بپرسیدنش | گهی از تعجب بمن دیدنش
گه آیا چه ذهن رسا داشت است | چنین ذهن هرکس کجا داشت است
شود روزی آن منتهی کاینچنان | نبوداست از هند تا اصفهان
ز یاد من آن محبت که آه | پی عمر و دولت دعا صبح گاه
به چشمش چو هر سال بالیدمی | وزد کام جان تا کجا بردمی
چه پر مغز بادام و شیرین رطب | چه دلکش انار و توائین عنب
مهیا همه تا چها خوردمی | وزد کام جان تا کجا بردمی
در اندر بنا گوشم انداختی | د دُر گوشم از پند پُر ساختی
سیه کردی از دوده چشمم همی | بُدی در سیه چشمیم عالمی

وزاں دو دہ خانی نہادے بلال کہ از چشم بد بودے در اماں
قبا راست کردی ببالائے من نظر دوختے بر سراپائے من
بفرقم نہادے کلاہ سمور ز چشم گزشتی و دیدے ز دور
کہ آیا چساں آیم اندر نظر کنم خوں بد اندیش را چوں جگر
بگیسوئے من شانہ یکسر زدے دل صد چو خود را بہم برزدے
ہمیشہ نہادی بروغازہ ام بہر حال دیدے تر و تازہ ام
ز خواہر ہماں شفقت از جانم یاد دگر گفتن اینہم کہ عمر تو باد
بمادر دعا گوئی من صبح و شام فدائی من و روئی من صبح و شام
برابر بجاں خواندیم ہر نفس غبار از رخ افشاندیم ہر نفس
ندانم چہ فہمیدی از ابر دیم کہ گفتی توئی قوت بازدیم
غزل خواندمی پیش او چوں بدرد گریستی و گفتی کہ فرداست فرد
دگر گفتی اے یوسفم در بلا نیم از حسود انت از درد آ
من آنم کہ گیرم ترا در پناہ روم افگنم دشمنت را بچاہ
زبیرا نہت دیدہ ام روشن است زیعقوب نے ایں حدیث از نمت
توئی ایکہ جاں منت خواندہ اند کراچز من ایں جانت خواندہ اند
فدائے تو من بلکہ خویش و تبار شوی شہرہ آخر بشہر و دیار
ترا زندہ دارد خدا تا ابد بتو صد مسیحا فند اتا ابد
پرستارہا یک از بہر کار تہیا کہ گوئیم کراتی بیار
بدلجوئیم ہر زماں ہر یکے بہ پہلو یکے بود و بر سر یکے
پئے ہر چہ دل خواستی یا زباں بجنبیدیم لب کہ گشتی ہماں
دعا گوئے صحت طلبگار خیر نہ خویش ایں چنیں مشفقم بلکہ غیر
دریں جا چہ آید بگوشم ایں زباں دو مصرع ز سعدی شیریں زباں
اگر بر وجودم نشستی مگس پریشاں شدی خاطر چند کس

گرفتی بتم گر بفرض اندکے　　نبردی ز غم جان از نہا یکے
شدے روز ہم گو نہ گر درد سر　　سر کس بہ بالیں نماندے دگر
غرض چوں زماں منقلب ہر دم است　　پس از بیکراں عیش بے حد غم است
از نہا یکے بر سر من نماند　　بجز شور اندر سر من نماند
کنوں بے کسی ہست و من وائے من　　دگر طالع پست و من وائے من
ہمہ خواب بود آنچہ را دیدے　　چہ خوش بودے ار گور گر دیدے
پدر از جہاں رفت و مادر نماند　　ز خواہر چہ پرسی برادر نماند
منم ایں زماں آں فرد ماندہ کس　　کہ بر وی تو آں گریہ ہا گر دو بس
الہیٰ کسے زار چوں من مباد　　اجل را طلبگار چوں من مباد
نمیزاد اے کاش مادر مرا　　چساں بگذرد بے برادر مرا
بہر حال چوں مردن و رفتن است　　غم این و آں خوردن رفتن است
بخود گفتم آں جا کہ رفتند شاں　　تو ہم می روی قصہ دیگر مخواں
ز رفتن بگوی د کن ایں راہ طے　　کہ جمشید گی ماند و کاؤس کے
کنی ابتدا از رفتگان گفتگو　　کنند از پس رفتنت ہم ز تو
دے عبرتے گیر از رفتگاں　　تو ہم بودہ گفتہ از رفتگاں

حکایت

بفضل خدائے زمین و زماں　　من تفتہ جان و من خستہ تن
ہراں کار کاغاز او ساختم　　بانجام آں نیز پرداختم
دو دیوان نوشتم جز ایں مثنوی　　دگر نسخہ ہا ہم بطرز نوی
کسے گفت تحسیں کسے آفریں　　من از جان فدائی جہان آفریں
وے بعد انجام آں جملہ کار　　گرستم بر احوال خود زار زار
کہ آیا چہ آغاز دل خوش کن آں　　دگر اینچہ انجام سوہان جاں
رسیدم نہ بر خاص مطلب ہنوز　　قیامت شد و شد شب اندر روز

در اصل آمدن هست آغاز کس | دگر از جهان رفتن انجام و بس
پس آن گو نه انجام پیش نظر | ندارد چرا چون من بے خبر
نه چون دل نگارد بر انجام اصل | ز عیش رسد تا چه پیغام وصل
روم کز خیالات بجهان آمدم | عیان تر روم گر نهان آمدم
الهی کسے سد راهم مباد | بجز رفتن از هیچ خواهم مباد

باب سیزدهم در خاتمهٔ کتاب

چو آمد کنوں جمله کار تو راست | دعا کن دعا گفته که وقت دعاست
جز این تا چه دیگر سخن گویمت | خدا را همان کن که من گویمت
دعا آدمی را رهاند ز بند | رهاند ز بند و کند بهرمند
دعا کن و زان پس سپاس خدائے | و زان هم چون فارغ شوی در خود آئے
خرد راست دانستن قدر خویش | ترا و مرا اے سر افگنده پیش
تو دانی که من هرچه داریم قدر | تو خوار و من ابتر چه داریم قدر
دگر از من و تو چه باشد سخن | منم بے تمیز چون تو و تو چو من
من و تو یکے برگ از آن باغ و راغ | که عقل اندر آن باغ و راغ است داغ
من و تو یکے ذرّه دیگر چه حال | همان خاک راه و همان پایمال
همانست گو نیست را کرد هست | ترا و مرا دل عطا کرد و دست
همانست گو آفرید این و آن | ترا و مرا جسم بخشید و جان
همانست گو زد سخن را بقند | ترا و مرا داد فکر بلند
همانست گو ساخت نطق و بیان | ترا و مرا داد کام و زبان
همانست گو هند را در سخن | کند پارسی و ختن گر زاد و بمن
همانست گو شاعرے آورد | درین جا و شعرش بهر جا برد
کند شهرهٔ شهرهایش چو ماه | بیا لیست گاہے و بدریست گاه

دہد لفظ را معنی کو دہد
تنِ مُردہ را جان و نیکو دہد

خودش ہر چہ بخشد ز فضل و ہنر
رساند خودش پیش اہل نظر

کند با غنش رحمتِ خویش را
کہ رحمت نداند کم و بیش را

پس از فیض دادن بشاعر دہد
نشاطیکہ چوں من ز جا بر جہد

دگر بے نیازش ز ہر کس کند
ہم اینگونہ نازش دگر کس کند

پس اینہا کہ گفتم ترا کار اوست
عبث سفلہ نازاں بنام نکوست

ہمانست ہر فعل را فاعلے
و لے باید این جا و صاحب دلے

کجا ہر دنی و کجا ایں تمیز
کہ داند چرا خوارم و چوں عزیز

عزیزی خواری بہم دلنشیں
ہم از دستش آں و ہم از دستش ایں

اگرچہ سخنہا بے گفتنی است
نگفت انچہ ہر گز نے گفتنی است

ہنوزم زند جوشہا بحرِ طبع
خوشا در معنی خوشا بحرِ طبع

ہنوزم نیامد بلب اندکے
کجا آں ہزار و کجا ایں یکے

مضامین ہجوم آورند آں قدر
کہ ناید بجز در کتاب دگر

و لے دید باید کہ عمر است چند
کہ بے عمر ایں خود نیاید بہ بند

الہٰی و لے چند دیگر زیم
دگر نہ ہنوز انچہ دانی نیم

انتخاب از تضمینِ گلستاں

خدا باشد نہاں و آشکارا — نگویم از چہ منت مرا خدا را
ازاں در طاعتش از خود رمیدم — کہ طاعت موجب قربت شنیدم
غم او گرچہ روزی موہبت — مزید نعمت اندر شکر او ہست
نباشد لحظۂ بے غم حیاتم — حیاتم را فدا ہر لحظہ ذاتم
دمے کاندر رود ہمدم ہمانست — چو بر می آید آہِ خونچکانست
غرض موجود در یک دم دو نعمت — چہ خوش یک آدم و با ہم دو نعمت
چہ گویم تا چہ احساں کرد با من — توانم شرحِ آں احسان کجا من
بہ بیں چوں خلعتِ ہستی بمن داد — سخن زاں بعد ایں لطف سخن داد
بایں لطف سخن خواہم جناں ہم — چو ایں ہم داد خواہد داد آں ہم

نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

پس از حمد خدا نعت محمد — کہ سازد کار ما نعت محمد
محمد آنکہ خوانند آفتابش — فلک رخش ست گو ماہ نو رکابش
محمد آنکہ وصافش ملائک — خود او جان و تن صافش ملائک
محمد آنکہ باشد سر بسر نور — ز مشرق تا بمغرب سایہ زدود
محمد کاں بود عاشق خدایش — خدا را تا چہ خواہد بود دایش
جز ایں دیگر چہ آیت ہا بشانش — کلام اللہ سر زد از زبانش
شفیع ما ہماں شافع دل افروز — نماید انچہ فردا دانم امروز

بہشت از من کزیں پس عہد کردم | بہشتی روضہ اش را گرد گردم
غرض گفتن نیارم ہرچہ بود است | کنوں بر آل و اصحابش درود است

سبب مالیت

ز فرزندانم آں فرزند کوچک | کہ پیتمبر ہمی خواندیش ہر یک
چہ پیتمبر در امر خیر ساعی | چہارم مصرعے بود از رباعی
چہ پیتمبر عزیز مصر جانہا | زلیخائے متاعش کاروانہا
چہ پیتمبر چراغ خانۂ من | دل من جان من جانانۂ من
چہ پیتمبر بمن بستان معنی | عیان از صورت اوشان معنی
چہ پیتمبر بمن ہر لحظہ ہم پائے | اگر من رفتہ جائے او نہ بر جائے
چہ پیتمبر روائے تا بر دوش | مرا پیوستہ ہمچوں دل در آغوش
چہ پیتمبر فروغ دیدۂ من | فراغ خاطر ژولیدۂ من
چہ پیتمبر انیسم در شب تار | اگر من خفتہ او چوں شمع بیدار
چہ پیتمبر دوائے درد ہایم | اگر من مضطر او تسکین فزایم
چہ پیتمبر بہر حال الفت آئین | اگر من رنجہ خاطر او غم آئین
چہ پیتمبر بدل از مہر جا گیر | بطفلی در خرد افزونتر از پیر
چہ پیتمبر سر نیکو نہادان | ادا فہم و ادا سنج و ادا دان
چہ پیتمبر بہ نیکی سخت کوشی | سخن نا گفتہ فہمی تیز ہوشی
چہ پیتمبر بآں گلگوں قبائے | برو صادق ادائے میرزائے
چہ پیتمبر فدایش جان تفتہ | نثار تفتہ و قربان تفتہ
چہ پیتمبر فصیح و خوش بیاں نثر | گلستاں بر زباں و بوستاں نثر
چہ پیتمبر ز من ترساں ز حد بیش | خجل از شوخی نا کردۂ خویش
چہ پیتمبر سزائی سربلندی | عیاں از جبہہ اش اقبال مندی
چہ پیتمبر بہار باغ ندرت | سمن بر لالہ رو شمشاد قامت

چه پیتمبر بهر شب ماهِ عیدم
مرادم مطلبم کامم امیدم

جهاں را گر پدر دُرود بمن داد
غمے کز دست آں غم بی سخن داد

مرا با خویش سوی آن جهاں بُرد
عیانست انچه میگویم نهاں برد

چه بازم کہ رفتم در رکابش
درنگم گشت قربان تابش

تمیزے گر کند کس در کم و بیش
من از وی رفته ام صد سالہ رہ پیش

هنوزش بود جاں بر لب کہ مُردم
سخن بودش نهاں بر لب کہ مُردم

بدیں سا رمز تنہاں باید رسیدن
بمرگ من فغاں باید کشیدن

تکلف شاعرے را نیست زنہار
نہ یک بار از جہانم رفتہ صد بار

ز شعر و شعر خوانی تا چہ حسرت ست
ز کام و کامرانی تا چہ حسرت ست

وجود این و آں لامی تواں یافت
فراق جسم و جاں را می تواں یافت

بسی دیدے اگرچہ جسم بیجاں
مراہم بیں کہ من خود بودہ ام آں

برای نام گوے یک طلسم
طلسم را کشا پرے چہ اسم

حزینے تفتہ جانے مشت خاکے
غنیمے بیدلی اندوہناکے

ز جانے سیرے غم فرزند خوارے
غریبے بیکسے بد روزگارے

چہ گویم تا کجا ضعفم رسانید
رسد گر گویمت نتواں مرا دید

کنوں بر لب نہ حرفے دیگر آید
دگر آید نہاں پیتمبر آید

تو گوئی برق بود آنکو مرا سوخت
نہ خود را بر سر ہر کو مرا سوخت

دگر زاں برق سوزاں ہیچ اثر نے
بجز خاکسترم در رہگذر نے

مرا ہر کس کہ بیند سوزد از درد
کہ بر خس طرفہ بیداد آتشے کرد

کجا ایں خس کجا بیداد آتش
فغاں از آب و خاک و باد آتش

بظاہر تفتہ ام اما ہماں خاک
کیم اے بر سرِ یک جہاں خاک

مرا صورت نماند و معنیم من
از یں بیش انچہ بودم آں نیم من

ہماں بستر ہماں زاری ہماں درد
مریضے چوں نزید با یک جہاں درد

چو من مشتاق مرگ ایں دم دگر کیست ‌ ز کلفت بر طرف کو من کجا زیست

خیالے گشته ام ز انساں که هر کس ‌ بخواب اندر مرا بیند ازیں پس

به بیدارے چه آیم در نظرها ‌ که رفت از خفتنم هر سو خبرها

منم در زندگیها خفته در گور ‌ غم فرزند جائے شمع بر گور

کنوں حالم نه آں کاید به گفتن ‌ بگفتن گو منه گوش شنفتن

من واز ناتوانیها یم ایں بس ‌ فرو ریزم گر انگشتم زند کس

گرم یک قطره از بحر بریدن ‌ ز مژگانم جهیا سے چکیدن

درم یک ناله از بیتابی دل ‌ جهم از لب کنم بر عرش منزل

چراغ صبحگاهی بوده ام من ‌ بود روشن که راهی بوده ام من

نیاید کس مرا زیں پس بزیرے ‌ من و بعد از دمی راهی و دیرے

غرض روزے هماں کز ماتم او ‌ چنینم وزیں چنیں دارم غم او

دم درس گلستاں بر زباں داشت ‌ که رحمت اے پدر بر من تواں داشت

نه مقصود من از درس همیں ست ‌ مراد من اگر یابی همیں ست

که عمر خود دریں فن صرف کردی ‌ دو صد دل خوں بیک یک حرف کردی

دبجشیدی ازیں دولت مرا هیچ ‌ نیم چوں که شد قسمت مرا هیچ

چو او مرد و بیادم آمد آں حرف ‌ بجانم زخمهاے تو زد آں حرف

زخود رفتم چناں کا یوالے واۓ ‌ دلم آمد بجاں کا یولے ایولے

بخود گفتم چه دیگر واتواں کرد ‌ بنامش نسخۂ انشا تواں کرد

بایں تقریب تا نامش بماند ‌ ے مقصود در جامش بماند

اگرچه او بلا کم کرد زیں ساں ‌ مسیحاے کنم با او من از جاں

وفاے او بمن هر چند معلوم ‌ کنم موجود آنکو گشت معدوم

روم تامش گزارم بر زبانها ‌ گزارم یعنی از وے داستانها

که داند هر یک آخر هست از نیست ‌ که پیغمبر که بود و آں فغاں چیست

جز ایں در خاطرم نگذشت باری — کزیں خوشتر نہ ہرگز ہست کاری

چو ہر بیت گلستاں برزبانہاست — فدائے لفظ و معنیہاش جانہاست

بہ تضمین آرمش نوعے کہ تحسین — کند خود سعدیم کاین است تضمین

بایں پیری زنم حرفی چناں خوش — کزو گردد شکلِ ہر بیت خوش

مضامینِ نوی آرم بد انساں — کہ گردد مشکلِ ہر بیت آساں

کند فردوسی از شفقت دعایم — بود در گلشنِ فردوس جایم

نظامی گویدم وقتِ تو خوش باد — وگر شد خانۂ نظم از تو آباد

بدست آرم ز خسرو خسرو بہا — بہ بخشم کہنگی ہا را نوی ہا

ز جامی جامے از احسنت گیرم — نگنجد غیرِ مستی در ضمیرم

نہد بر لب ثنائے من ثنائے — کند ہر شب ثنائے من ثنائے

بہ پیشم ناز دار بر نکتہ رائے — بمیرد عرفی اندر نوجوانے

ہم داند نظیر خود نظیری — ہم خواند نظیر خود نظیری

شود شاد از ظہورِ من ظہوری — کند یاد از ظہورِ من ظہوری

اسیر اندر فلک سیرے اسیرم — شود چندانکہ ناید در ضمیرم

کشم اندر ادا بندی بہ بندش — ترا و د پستی از طبع بلندش

اگر خواہد کہ بر من غالب آید — خلل اندر دماغِ طالب آید

حزیں گر داندم نا فہم و نارس — فتد از لاہجاں اندر بنارس

بود غربت نہ آں آفت کہ گویم — صد آفت بہ کہ یک غربت چہ گویم

در از غالب سخن راندن توانی — من و مغلوبی و عجز آنکہ دانی

بہ پیشِ ہر یکے دارم بسے قدر — و لے من آستانِ غالب بود صدر

بتائیدش کنم کارے کہ بینی — تمام طرفہ گلزارے کہ بینی

ہر آں معنی کہ در لفظ از من آید — نہ معنی جانِ پاک اندر تن آید

بہر مصرع کہ بیتے در رسانم — بتابش بر فلک یکسر رسانم

فصاحت ہر کرا باید فصاحت — بلاغت ہر کجا شاید بلاغت
ہم پیش نظر انداز سعدی — کنم پرواز بر انداز سعدی
چہ دور از فیض عالی مصرع او — کہ تابد مصرعم از کہکشاں رو
سخن راتم ز پیغمبر درانجا — دُر افشانم ز پیغمبر درانجا
بگریم در سخن افزایم آیے — نویسیم بعد ازاں نادر کتابے
شود تازندہ پیغمبر دگر بار — دہد داد مسیحائیم ہر بار
ادا گردد حق او نیز از من — دگر یرد او کدامیں چیز از من
کنوں یاد از کفن می آرم ویس — ازیں از دید ہائی یارم ویس
دریں رہ ہمتم چوں بود کامل — رسیدم در دمے آخر بمنزل
تمام ایں نسخہ را کردم بہر حال — مضامینِ نو آوردم بہر حال
نوشتم ہر چہ بپسندید ہر یک — دگر از چشم حق بیں دید ہر یک
خصوصاً میرزائے نکتہ زائے — چمن طبعے گلے رنگین ادائے
بستانِ سخن را طرفہ شیرے — اسد یعنی بہر میداں دلیرے
قصائد زوچناں کش دید باید — گل از باغ غزلہا چید باید
رباعی آنکہ شورش چار سو ہست — دگر باور نداری روبرو ہست
مپرس از قطعہ اش گردد زباں قطع — اگر گویم بہشت آمد بہ آں قطع
ز نثر او ظہوری را جگر خوں — ابوالفضل ست اندر خاک مدفوں
دگر انداز اخلاقش کہ گوید — ہماں داند کہ در راہش بپوید
ہر آنچہ از وے بود قربان یاراں — بجانِ وے دعائے میگساراں
دگر از سیم و زر کا صلا ندارد — دگر دارد چو ابر از کیسہ بارد
نباشد صرفہ اش ہرگز در اسراف — اگرچہ حرفہا باشد بر اسراف
سخن اینست و بس من ہیچ بوم — بر آں نکتہ رس من ہیچ بوم
بود تا میرزا غالب ز من شاد — خراب من سراسر باشد آباد

فدائے میرزا غالب دل و جاں　　گدائے میرزا غالب دل و جاں
چہ غالب ہم نوائے قیصر و جم　　چہ غالب میرزائے قیصر و جم
باہل فارس غالب غالب ما　　بہ از عرفی و طالب غالب ما
دُرے از دُرجِ توراں چشمِ بد دور　　مگو از سایہ کاینجا سربسر نور
دگر از بندہ گفتن روسیاہی ست　　گواہِ تفتہ از مہ تا بماہی ست
چہ گویم تا چہ رحمت کرد با من　　وگرنہ کو جنابِ او کجا من
رسد تا زش چہا بر فرقدانم　　رسانید از زمیں بر آسمانم
بود ہر ذرۂ او آفتابے　　درش را خواندہ ام روشن کتابے
اگر صد دفتر از مدحش نگارم　　یکے باشد یکے از صد ہزارم
الٰہی بر سرِ من سایہ اش باد　　ز ہر پایہ فزوں تر پایہ اش باد
بماند تا ابد باقر علی خاں　　کہ از پورانِ او پورِ خوش ست آں
کند عمرِ خضر حق روزیِ او　　بود تا خیر خیر اندوزیِ او
چساں در شکر گویائش در آیم　　کجا از عہدۂ شکرش بر آیم
غرض در ہفت یا در ہشت ہفتہ　　رقم ایں نسخہ زد بے مایہ تفتہ

تاریخِ اتمام و نامِ کتاب

چو یا شد معنیِ ایوائے افسوس　　نہ زیبد اندریں جا جائے افسوس
شود تاریخِ ختمش اے نکو رائے　　ز تضمین گر بر آرے لفظِ ایوائے

۱۲۷۲ھ

آغازِ تضمین

تنہا نہ من و عذرِ کہ شکرش　　کے از منِ کوتہ نظر آید
در وہم و گمانِ کہ بگنجد　　از دست و زبانِ کہ بر آید

آں کز پئے خوشنودی عاصی — عفوش ز گنہ پیشتر آید
تو خود بدہ انصاف کہ باشد — کز عہدۂ شکرش بدر آید

باب اوّل

حکایت بادشاہ رنجور

بشب تو آئی و ابر آید و دگر ہمہ دوست — بمن تو باشی و می باشد و دگر ہمہ چیز
دریں ہوس بگذشت آہ وقت عیش و نشاط — دریں امید بسر شد دریغ عمر عزیز
نیامد او ز درد آمد آہ جاں بلبم — دگر کجا بلبم آہ جانگداز آید
ہمیشہ در دلم ای وائے ایں تمنا ماند — کہ انچہ در دلم ست از درم فراز آید
دلم ز بخت سیاہم بحیرت و من ہم — خموش باشم و گویم بلے چہ فائدہ زاں
بجود نبودم و او زلف عنبریں بکشاد — امید بستہ بر آید و لے چہ فائدہ زاں

گذشت دلبر و گوید دلم شو نومید — بعید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید
بمصلحت شنوم ایں دروغ از و ورنہ — امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید

دور آخر رسید شکر خدا — ساقیا مژدۂ بہست اجل
یعنی اکنوں چہ دیر در کوچ ست — کوس رحلت بکوفت دست اجل

حسرت نظارہ بعد ازیں مزنید — قصۂ گریہ مختصر بکنید
عاقبت خاک می شود سر تیز — اے دو چشم و داغ سر بکنید
غیر ازیں دیگر ایں زماں چہ کشید — یاد ما یا بکار یا نبرد
کار از دست میرود اکنوں — اے کف دست و ساعد و بازو

ہرچہ کردید پیش ازیں کردید — بعد ازیں ایں خوش ست اگر بکنید
یعنی از یک دگر بود رنجے — ہم تو دیع یک دگر بکنید

دشمنی ہا بکام خود کردم — ستمندی نداد فرصت تام
رحمت اکنوں رواوگر برکیست — برمن مستمند دشمن کام

دشمناں نیستند قابل رحم — رحم برمن کنید اگر بکنید
چندبے یک نظر من وایں حال — آخراے دوستاں نظر بکنید
کیست تا کامی مرا مانند — کیست تا دانی مرا ثانی
غرم آمد بسر بتا کامی — روزگارم بشد بنادانی
میکند عاقل از بلا حذری — عاقلاں قصد مختصر بکنید
یعنی آں طفل بد بلاست ازو — من نکردم شما حذر بکنید

حکایت ہرمز

ترا گفتہ خواند حکمت پناہ — کند کار بے حکمتی کے حکیم
شنیدم کہ ترسد ز تو خصم تو — ازاں کز تو ترسد بترس اے حکیم
مکن تکیہ بر قول او اعتماد — کہ خصمت ہمانست بی نام و ننگ
اگر با چنو صد برآے بصلح — وگر با چنو صد برائے بجنگ

حکایت درویشی مستجاب الدعواۃ

نہ تو مہرے نہ ذرہ من ہرگز — نہ تو عرشے نہ من زمیں زنہار
تو زبردست و زیردست منم — اے زبردست زیردست آزار
لے لیتی طبع تو بے مثل — و آتش خشم تو جہنم وار
مرد تا چند باشد ایں مظلوم — گرم تا کے بماند ایں بازار

گویدت چند غنچۂ دل چونے | عقدہ نکشایدت جہاندارے
تو نیائی اگر بکار جہاں | بچہ کار آیدت جہاندارے
ہر غمے کز تو من خورم یارے | خوردنت بہ کہ مردم آزارے
ہمہ مردند مردم از آزار | مردنت بہ کہ مردم آزارے

حکایت سیاہ گوش

ازیں خود چیست لطف مذہب او | کہ در ہر حال گبر آتش فروزد
ہماں خام ست ہچوں مذہب خویش | اگر صد سال گبر آتش فروزد
مرا ایں آتش خشم ست وائے بخیر | تو پرسی کس چساں آتش فروزد
سمندر تا دو صد سال وجز او کس | اگر یک دم درو افتد بسوزد

رباعی

ہر چند بنعش ما بود تازہ بہار | از آمدنِ تو اے سراپا گلزار
ما از سر آرزو گذشتیم وہوس | تو بر سر قدرِ خویشتن باش وقار

رباعی

گر غیر بیازی و ظرافت شدہ خوار | اے نقتہ بیا ترا ایں ہر دو چہ کار
غیرست ندیم و خواری غیریاں | یازی و ظرافت بندیمان بگذار

حکایت یکے از رفیقان

دل غم ہمہ گفت وکس ندانست کہ کیست | رسوا شدہ مفت وکس ندانست کہ کیست
بس نالہ کشید وکس نپرسید چہ شد | بس گرسنہ خفت وکس ندانست کہ کیست

رباعی

از حالت نقتہ ما چہ گوئیم کہ چیست | صد مرتبہ مرگ بہ از آں بد تر زیست
تنہا نہ ہمیں دلش بجاں آمد و مرد | بس جاں بلب آمد کہ بر وکس نگریست

رباعی

باب دوم

حکایتِ دو بزرگاں

چہ بگویم دراں چہا یابے | چہ نویسم دریں چہا بینی
ہر کجا خبر بر ملا یابے | ہر کرا جامہ پارسا بینی

نقدہ رنداست گو بباطن لیک | تو ز کف رسم ظاہری مگذار
باخدا گیر و صبح خیز شمر | پارساداں و نیک مردانگار

اے کہ گفتی چہ گفتنیش از من | من خموشم دگر بیانش چیست
الغرض حرف مدعی مشنو | گر ندانی کہ در نہانش چیست

ولہٗ

من اگر رند پارسایاں را | بمن رند ابلہانہ چہ کار
اے کہ گوئی تو مے خوری پنہاں | محتسب را درونِ خانہ چہ کار

حکایت عبد القادر گیلانی

اے کہ پرسی بحرِ خویش ترا | چہ مرادست ہرزہ می پویم
ہر چہ یا یادمی تواں گفتن | روی بر خاک عجز می گویم

اے کہ پرسی کہ از گلستانم | بتو بوئے وداد می آید
خاک در چشم دشمن من و تو | ہر سحر گہ کہ یاد می آید

چہ سخن گفتم و چہ شنید اکنوں | بے زبانم چہ غیر ازیں سخنم
تو بہ ... یاد من | ... کہ ہرگز فراموشت نکنم

نیست ترک ادب کہ ایں یک حرف — برلبم از اتحاد می آید
اے کہ پرسی خدای تو کہ بود — بیچت از بندہ یاد می آید

یک قطعہ بہ تضمین استعانت

قدم زد زاہدے با مردم دہ — دگر گویم چہ حال آں رنجدہ را
نمی بینی کہ گاوے در علف زار — بیالاید ہمہ گاوانِ دہ را

ز تنہا غنم صبح ناگہ شب — دل من تراشیدہ در مجلسے
بصد رنج افتادہ چندیں جلیس — یک ناتراشیدہ در مجلسے

ازیں کز جہالت زند حرف سخت — وزیں کز فضولیست خنداں لبے
بود خاطر اہل دل بس ملول — برنجد دل ہوشمنداں بسے
بگویم بباغ و بجویم سراغ — بگوشم [illegible] و بنوشم شراب
اگر باغ خالی نگردد ز گل — اگر برگ پُر کنند از گلاب
چہ خوش صبح من بود دم و چند تن — بجوشے کہ بود آب و مے خود گلاب
چو غیر آمد ایں گفتم و تلخ تر دم — سگے در وے افتد کند منجلاب

دو قطعہ بہ تضمین استعانت

نکوی بمی اے ساقی ایں زماں کہ مدام — نکوی تو بہر بزم مے شود مذکور
نماند حاتم طائے ولیک تا باید — بماند نام بلندش بہ نیکوی مشہور

ولہ

چو ہست حسن تو مائی زکوٰۃ آں بوی ست — دگر چہ گویمت اے نکتہ سنج اہل شعور
زکوٰۃ مال بدر کن کہ فضلۂ رز را — چو باغباں ببرد بیشتر دہد انگور

باب سوم

حکایت حاتم طائی

نقد گوبی عمل از عمری نیست — نان ہماں از عمل خویش خورد
آری اصلا نخورد طعنہ زکس — ہر کہ نان از عمل خویش خورد
اے خوش آنکس کہ گرافتد در دام — میرود نام رہائے ببرد
بزم چوں زدل خود منت — منت حاتم طائے ببرد

حکایت موسیٰ علیہ السلام درویشے راعید

اے کہ فرمائی فلاں یعنی عدو — کارہا کردی اگر زر داشتی
نام گنجشک از جہاں عنقا شدے — گربہ مسکیں اگر پر داشتی
قصہ ہر خرد و کلاں صیدائے ہما — ہرگہ آں شوخ ستم گر داشتی
خالی از باز آشیانہا ساختی — تخم گنجشک از جہاں برداشتی

ولہٗ

ایں کہ اکنوں در بہر سفلہ است — شد دو روزی چوں علم افراشتی
صد جماعت رایک دیگر زدے — ہیچ کس راگر دخود نگزاشتی

ولہٗ

لاغرش کرد ایں چنیں ماہ صیام — ورنہ زاہد فتنہ ہا برداشتی
رفتی از جائے و نیز آو یختی — ایں دو شاخ گاو اگر خر داشتی

رباعیات

گیرم کہ جہانے از تو رحمت یابد — گیرم خود حاتم از تو ہمت یابد
سازے بعد و ایں ندانی چہ کند — عاجز باشد چو دست قدرت یابد

ولہٗ

از نیک بے تفاوت آمد نابد — بد آنکہ چو زور گیرد و زر یابد

بنشیند و فکر خستن خلق کند — بر خیزد و دست عاجزاں برتابد

ولہ

پیچ نگیرد ز فلاطوں عیار — پیچ نبود دست ارسطو بمرش

اہل تمرد را شمر و سفلہ — سعد چو جاہ آمد و سیم و زرش

عشق دہیم بسر و ردی او — درد دہنا بم بسخن اندرش

پھر کجا درد سر او را کجا — بیلے خواہد بعزودت سرش

نفقہ پسند حکما می بود — من ز تو این راز نخواہم نہفت

پیر تم اصلا مطلب از فلک — آں شنیدی کہ فلاطوں چہ گفت

ولہ

جا تو رے را کہ تمناست زیست — چارہ نبود دست جز ایں دیگرش

مار ہماں بہ کہ نیاید بروں — مور ہماں بہ کہ نباشد پرش

باب چہارم

دمن دہ تعتہ ہماست بے سخن کیس توز — یہ بیش آنکہ محبت نبرر گتر عیبی است

نوش ست گر نمائی کلام من بعد — ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبی است

ولہ

بعکس می نگرم جملہ فہم ورائے امروز — ندانم ایں چہ زمان است وایں چہ کار است

زراست نقتہ و نزدیک حاسداں ہر کس — گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

اے کہ فرمایئم چہ پر نور است — می تواں دید روز چشمۂ ہور

پر تو روی یار ما بود است — نور گیتی فروز چشمۂ ہور

دست انصاف کاش کہ یک شب — خاک باشد بچشم موشک کور

زانکہ خورشید با چناں خوبی — زشت باشد بچشم موشک کور

حکایت ناخوش آوازی

از حرم آئی و پلید آئی — بے وضو خوانی و غلط خوانی
شیخ گو حافظے خدا حافظ — گر تو قرآں بدیں نمط خوانی

تو نہ کافر نہ مؤمنے یعنی — شوخ و بیباک گر بدینسانی
بدہی آبروئے کفر بباد — ببری رونق مسلمانی

باب پنجم

یک قطعہ بہ تضمینے اصفہانت

تفتہ جز گرد غم نباید رُفت — تفتہ جز در لحد نباید خُفت
آں شنیدی کہ شاہدے بنہفت — با دل از دست دادہ می گفت
تا کجا پرسمت کہ منظورت — تا کجا قدر خویشتن باشد
قدر کس زینہار نشناسی — تا ترا قدر خویشتن باشد
اے کہ گوئی ز دو ذرہ کم دانم — تو بیا گو ہزار من باشد
در نکایت چہ رتبہ دارم من — پیش چشمت چہ قدرِ من باشد

رباعیات

اینست کہ با عشوہ و ناز آمد پیش — انیست کہ با زلفِ دراز آمد پیش
تا باز چہ پیش آیدم از بخت سعید — آنکس کہ مرا بکشت و باز آمد پیش

شوخی کہ حذر کند ز برگشتۂ خویش — بیند نہ دمی ز دود دل کشتۂ خویش
آدر بگور تفتہ شمعے از ناز — تا تا کہ دلش بسوخت بر کشتۂ خویش

بغیر از عشق دستانِ نوائے شیخ — بہ پیشِ ما چہ حاصل گر بخوانی

نحو اے حرفے ار از عشق ہیچ است　　اگر خود ہفت سبع از بر بخوانی

سبق از عشق اگر خوانی کہ گوید　　تو اے مفتی الف یا تا ندانی
دم تکرار را و نون و جیمش　　چو آشفتی الف یا تا ندانی

من و تو یکے و ہر گز من و تو نیست فرقی　　ز دوئی مگو کے ایں جا ز دوئی سخن بماند
ستم است با ظہورت ز ظہور من سخنہا　　عجب ست یا وجودت کہ وجود من بماند
دم عذر مستی تو من و شکوۂ تو بہتان　　چہ سخن بود کہ پیشت بزبان من بماند
سخنی است اینکہ ماند بزبان بخبر درنہ　　تو بگفتن اندر آئے و مرا سخن بماند

حکایت یکے را ذنے صاحب جمال در گذشت

سادہ رو تا کہ ماند ماند اکنوں　　عاشقاں را بادچہ کار بماند
جیت کو چید حسن و آمد خط　　گل تباراج رفت و خار بماند
سپہ ناز و غمزہ ہم برگشت　　بعد ازینش چہ اختیار بماند
داشت گنجے بزلف یعنی دل　　گنج برداشتند و مار بماند
اے کہ گوئی بیا ز ما آموز　　گل و ریحان و ارغواں دیدن
بہ ز آموختن چنیں پیشم　　دیدہ بر تارک ستاں دیدن
دل بہ تیغ حرامیاں دادن　　دیدہ بر تیر رہزناں دیدن
بہتر از عیب دوستاں جستن　　خوشتر از روے دشمناں دیدن
دشمنند ایں برادر و فرزند　　عالمی ہست عالم تجرید
بہر یک دوست کش خدا نام است　　واجب است از ہزار دوست برید
دو ستم گفت من ترا از دل　　ہر زہ گر دیدنت نباید دید
گویمت انفس خویشتن را کش　　تا یکے دشمنت نباید دید

باب ششم

حکایت با طائفہ دانشمنداں

بنا کامیم شد بسر ہر چہ بود | کنوں مردہ ام عمر کو من کدام
دمے بود از عمر و ایں حق ہیں | دمے چند گفتم برآرم بکام

ولہ

رسیدم دریں منزل از راہ دور | زبسیار پیش و زبسیار پس
نفس راست کردم درایں جا دمے | کہ ناگاہ بگرفت راہِ نفس
زہے خضر و عیسیٰ کہ باشد یکے | دل عمر و دیگر بود جانِ عمر
مرا جا ندادند بیش از دمے | دریغا کہ بر خوانِ الوانِ عمر

ولہ

پچھا بود نعمت بریں خوان و باز | پچہار اند ما را فلک چوں مگس
دمے چند ماندیم و گفتند خیز | دمے چند خوردیم و گفتند بس

ولہ

ہنوز غصہ زصد یک نخوردہ شبِ ہجر | ہنوز نالہ ہجراں نکردہ نفسے
ہنوز یا چو تو دی دل ندادہ یعنی | ندیدہ کہ چہ سختی رسد بجان کسے

ولہ

ہزار رنج بہ پیرے وزاں ہزار یکیست | پس اینکہ گوید تت اے توجواں سخندانی
چہ ژالہ ہا کہ نمی او فتد ز چشم کسے | کہ از دہانش بدر می کنند دندانی

ولہ

تو پری اے کہ زخوش خلقیم کہ در شبِ وصل | کدام از ہمہ ساعات خصم جاں ساعت
بر تو باشی و دل کامجوی و گردد صبح | قیاس کن کہ چہ حالت بود دراں ساعت

ولہ

یں اینکہ تو پری باں شکیب و سکوں   چہ رفت بر تو چہ رفت از بر تو جانانے
ود خیال کن آخر رود چہ بر تو دمے   کہ از وجود عزیمت بدر رود جانے

ایں نگویم کہ کس ز مردن کس   بہ عجب درد و غصہ می کاہید
خود بہر دم دمے کہ بر گذرے   پیر مردے بہ نزع می نالید
ایک پری ز عشوۂ دنیا   ہر چہ گویم می تواں فہمید
درد سر داشت تفتہ و گویند   پیر زن صندلش ہمی مالید
دشمن و دوست جملہ حیرانند   چہ منم ایں دم و چہ حال مزاج
ہمہ عیسیٰ دماں فرو مانند   چوں مخبط شد اعتدال مزاج
اے معالج ہمیں بہ بیمارش   وقت رحلت اثر کند نہ علاج
نہ دعا کارگر شود نہ دوا   نہ عزیمت اثر کند نہ علاج

باب ہفتم

جدال سعدی

ببیں ایں را و آں را ایک گوئی   لیئماں را بدست اندر درم نیست
کریم من ولے دانم کہ ہرگز   کریماں را بدست اندر درم نیست

ولہ

جو یم خوں مقر ما خوں چہ باشد   چو خواہم غم مدہ فرماں کہ غم نیست
دا اینکہ گویم اے خدا و ند   خدا وندان نعمت را کرم نیست

ولہ

اے فقیر چہ آدے بجز فغاں بر لب   تو اے فقیر چہ داری بجز پریشانی
نگراں را عیش است و خوشدلی و نشاط   تونگراں را وقف است و نذر و مہمانی

ولہ

بیا وُ از من درویش ہم ببیں یک رہ — ۓ و معنی و بدمستی و غزل خوانی
تو اے کہ گوئیم آید چہ خوش ز سلطاناں — زکوٰۃ و فطرہ اعتاق و ہدی قربانی

ولہٗ

تو و ہمیں کہ بظاہر چہ راحت است مرا — تو و ہمیں کہ بہر دم ز رنج پنہانی
شہان ہر آنچہ کنند اے فقیر شوار است — تو کے بدولت ایشاں رسی کہ نتوانی

ولہٗ

بزلف کیست خیال تو و کنی چہ نماز — دل تو در ہم و جاں ہم بصد پریشانی
غرض تو تفتہ کجائے و آید از تو کجا — جز ایں دو رکعت و آں ہم بصد پریشانی

یک قطعہ در تضمین استعانت

اے کہ غم را گرفتی از وے باز — چہ خورد تفتہ و دل و جانش
شب پراگندہ خسپد آنکہ پدید — نبود وجہ بامداد انش
خط او آنقدر نہ دل بے وجہ — بردہ ہم می برد ز جاناناں
تا زمستاں بسر برد بفراغ — بود گرد آورد بتابستاں
تفتہ میکش نہ آنچناں بود است — یک دو قلزم کجا قرا وانش
ے اگر میدہی فراواں دہ — تا فراغت بود زمستانش،
نہ بینم بحق مشتغل چوں ترا — تر سم شوی روز محشر خجل
گرا ہے دل خداوند در دو ئی — خداوند نعمت بحق مشتغل
نہ در رقص جان و نہ در نغز لب — نہ در عیش با و نہ در خندہ دل
مپرس ایں کہ بے غم ترا حال چیست — پراگندہ روزی پراگندہ دل

رباعیات

اے تے کہ خرد ترا بچندیں سن ہیچ — کافر ہیچ است پیش تو مومن ہیچ
آخر چہ ازیں گوش خراشی سود ت — اے طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ

ولہٗ

ہاں تا چہ بایں پیر کنی وقت بسیچ　　وقت است چہ تاخیر کنی وقت بسیچ
نے از تو نخوردہ رہروی پارۂ نان　　بے توشہ چہ تدبیر کنی وقت بسیچ

ولہ

اے زاہد صد سالہ نداری چوں ہیچ　　دانی کہ چہ مشکل فتدت وقت بسیچ
یک دانہ ز خرمن نکوئی کا نیست　　تسبیح ہزار دانہ بر دست بپیچ

ولہ

زنان و نفقہ چہ آری بلب سخن زیں نوع　　ز فقہ و فاقہ چہ رانی حکایت اے درویش
تو خود بیاب کہ کردی کدام کارِ نکو　　مکن ز گردش گیتی شکایت اے درویش

ولہ

چو بایلے بکسے نفقہ از بلا چہ سخن　　چو عاشقے نہ عجب ایں کہ از قلق مردے
مکن ز خال و خط و زلف یار خود گلہا　　کہ تیرہ بختی اگر ہمبریں نسق مردے

ولہ

مباش تنگ دل و دستگر مردم شو　　خدائے را چو دل و دست کامرانت ہست
بنہ بدستِ فقیری ز صدق دل چیزی　　تونگرا چو دل و دستِ کامرانت ہست

ولہ

بسیم و زر سر دنیا و آخرت باید　　چہ سود ازیں کہ نہ بخشیدی و نہ خود خوردی
بدہ بکار کہ ایں ہر دو عالم از تو بود　　بخور بخش کہ دنیا و آخرت بردی

باب ہشتم

رباعیات

ظاہر نہ چنیں لطیف و خوشتر باشد　　ظاہر نہ ہمیں لباس و زیور باشد
از باطن کس شود نہ ہر کس آگاہ　　بس قامتِ خوش کہ زیر چادر باشد

ولہ

اے شیخ کہ ترا چہ در سر باشد — نا دیدہ بکس عشق نہ بہتر باشد
روئے کہ نہفت است عروس دنیا — چوں باز کسی مادرِ مادر باشد

ولہ

اے کہ ایں لحظہ می کنی انکار — ترا نچہ بر تو گذشت آنجا دوش
اگرت طعنہا زنم بشنو — و گرت سرزنش کنم خاموش

ولہ

زروزہ و زنماز و ز تقوی و ز ورع — کراست تقتہ دریں شہر ہرچہ با تو ہست
بیا و می خور و بہ ہرچہ ہست دست فشاں — کند ہر آئینہ غیبت حسود کوتہ دست

ولہ

بجاست دشمن اگر جابجا بدم گوید — کز و جواب نیاید نمودم انچہ سوال
جز ایں چہ چارہ ہما تاکنوں چناں کس را — کہ در مقابلہ گنگش بود زبان مقال

ولہ

بیا در گوش گیر از گنج اسلاف — بجود دارم یکے پارینہ گوہر
ہنر بہتر ز گنج گوہر آمد — ہنر بنمائے گر داری نہ گوہر

ولہ

دیدم یکے را کہ بآں گوشہ نشینی — می گفت کہ دنیا نہ زیبا گوشہ نشینید
آرے چہ نشیند بدلش جز غم دنیا — عابد کہ نہ از بہر خدا گوشہ نشیند

یک قطعہ بہ تضمین استعانت

سخن گذشت شب از ترک و اختیار فلاں — کہ گفت سعدی شیریں زبان سحر بیاں
ہزار بار چہ آگاہ خوشتر از میداں — ولیکن اسپ ندارد بدست خویش عیاں
سلاطین جہاں بودند از دل — زبس مشتاق دیداں نہ جبیں را
پئے نقش انچہ می بایست گفتن — فریدوں گفت نقاشان چیں را

چه عیب ار گفتی اہل خانقه را | که شمع بزم ما ہر شب فروزند
یکے گفت است ایناں را ازیں پیش | که پیرامونِ خرگاہش بدوزند

رباعیات

دانی که کدامین دو کس اند ہمه خوار | وز خواری خویش پیش ما قابل دار
مفتی که بحیلت طلبد پنج درم | قاضی که برشوت بخورد پنج خیار

ولہ

دہقان پسرا تو ہوشیاری بسیار | ویں قاضی مرتشے بغایت طرار
برداری اگر بحیلتی پنج انگشت | ثابت کند از بہر تو ده خربزه زار

ولہ

ازیں کلام ندانم چه باشدش مقصود | وزیں سخن نیم آگه چه داشته است مراد
نگفت ہیچ از ابری و طرفه ایں گوید | ورت ز دست نیاید چو سرو باش آزاد

ولہ

ہر که مردِ گزیده است اصلا | نگزیند بخیل فاضل را
من نه تنہا بپوشم از وی چشم | کس نه بیند بخیل فاضل را

تا چه بعد از غضب شود عیار | آنکه چوں بحر در غضب جوشد
گوید اے نقد خوش ہنرمندی | که نه در عیب گفتنش کوشد
ایں بلیہای عام بیہده گوست | واں بدلہای خاص ره دارد
گر بخیلی بصد ہنر ممتاز | ور کریمی دو صد گنه دارد
قلمش نکته ہا فرو بارد | زرش عیب ہا فرو پوشید
نقد بود است عیب اگر ہمه تن | کرمش عیب ہا فرو پوشید
ز نظم دگر کس که نا آورده به | سخن و نامهٔ خویش آراستن
غرض اے توانگر خوش آمد مرا | کہن جامهٔ خویش پیراستن

بآزاد مردے چہ منت نہی — وے واز در آرزو قاستن
کہن جامۂ سرداے نوبہار — بہ از جامۂ عاریت خواستن
گفتن شعر راکہ گوید بد — نیک بینید ماچہ بد کردیم
ور بگوید ہرزہ گوئیہاست — ما نصیحت بجاے خود کردیم
دوستاں گر خورید حیف بما — کاینقدر ازچہ ما جگر خوردیم
نتواں بروچوں بسر بے شغل — روزگارے دریں بسر بردیم
ایک گوئی تو گفتی انچہ کنوں — ور نیاید بگوش رغبت کس
گر بگو سفتہ ام وے چہ کنم — گر نیاید بگوش رغبت کس
یارہا گفتم و دگر گویم — غزل نقفۃ باغ باشد وبس
گر نیاید کسی بہ گلگشتش — بر رسولاں بلاغ باشد وبس

تضمین گلستاں۔

مطبوعہ مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۳ء

انتخاب از غزلیات

از تو اے جان کاروانی ها — دلستانیست جانستانی ها
وصل هم دست داد من خاموش — داد از دست بے زبانی ها
خاک گشتم من و تفتیش نیست — خاک بر فرق بدگمانی ها
در سوال من و جواب کیست — ارنی ها و لن ترانی ها
از تغافل نگاه او پیداست — دیدم آن دیدن نهانی ها
پیش ازیں داشت او رخم هم بحل — پس ازیں ما و شادمانی ها
مرحبا وضع خوش ادای دوست — حبذا طرز خوش بیانی ها
من که جان بر کفم در پیا خیال — میدهم داد جانفشانی ها
بر نخیزاندم کس از در دوست — زود قربان ناتوانی ها
دل فدای نشانه گشتن خویش — تفته قربان شیخ کمانی ها

بیتابی تو در چمن ها — سنبل ها سرو ها سمن ها
کو برگ گل و کجا لب او — باشد بجو شیم سخن ها
مستان ترا که داند اسرار — بے خویشتن و بخویشتن ها
دلها رابیں و دیدها را — برهم شده بی تو انجمن ها
آواره مگیں نه صبر عشاق — عشاق غریب در وطن ها
خاکستر دل کجا نشینید — جمع است لبیته سوختن ها

یکبار رنگش کہ تو واں نیس — داریم بدوش خود کفن ہا
یارب چہ وزد دیدہ در چمن باد — گلہا زدہ چاک پیرہن ہا
آں طرہ نسیم را طلب کرد — ایں مژدہ برید در ختن ہا
یا نقتہ بفہم تست ہمے
یا در سخنم بود سخن ہا

رو میرس آغاز و انجام مرا — بیں بجز ادے ہر زماں جام مرا
جاں ببین معلوم و گوید قاصدش — از چہ دیر ایں گونہ انعام مرا
چوں ازو پرسم کرا گویم دعا — زیر لب گوید کہ دشنام مرا
میکنم طوف حرم بت در بغل — ربط با کفر است اسلام مرا
بردنم با اوست قاصد گر نہ سہل — چوں نباید برد پیغام مرا
در امیدش جانم آید گو بلب — کی کند آں لب ادا دام مرا
ہر قدر ہا عیب در خود کامی است — گفت باید یار خود کام مرا
چند سودائی مرا خواند خام — پختہ سازای سوز دل خام مرا
خواندہ است از صبر عمرے درس رام — رام نتواں کرد آرام مرا
نقتہ ام من نقتہ دشمن را زباں
جملہ سوزد چوں برد نام مرا

کردم از دنیا حذر قصد دگر دارم بیا — آمدم تنگ از حضر عزم سفر دارم بیا
گر بجوں غلتیدن دم مردن ندیدی از کسی — زخم پیکان تو در دل کارگر دارم بیا
صد جفا بل بیش بر من شب ہجراں تو رفت — یک نفس بل ندم ہم چوں شمع سحر دارم بیا
در دست یا عیش ابد یا عمر یا عہد شباب — تا چہ رفت از من کہ بر لب بیشتر دارم بیا
یا بروں از دیدہ دست از حیات کن شی — چشم تر دارم ببیں حالت تبہ دارم بیا
باغمی در دل ایندم یک دو آہ ناتواں باقیست — بر لب اکنوں یک دو حرف مختصر دارم بیا
وعدہ اش کردا ست بیدادی کہ صد رہ داد از دو — اے قیامت انتظارت بیشتر دارم بیا

از تو لب اے نالہ ہم سو سخن دارد برو   در تو من اے گریہ امید گہر دارم بیا

آں قد و رخ در دل و دل جلوہ گر در چشم تر   سرو و گل در باغ و باغ اندر نظر دارم بیا

تفتہ مقصودم بجاں تیغ و تبسم خوی او

بیقراری حرفے نگویم درد سر دارم بیا

کاہ مہتاب کہکشاں مہتاب   از زمیں تا با آسماں مہتاب

جسم بے روح گر شب تار است   روح در جسم بیکشاں مہتاب

شب وصل است و دیریم این است   پیر صبح است و نوجواں مہتاب

از لب بام او نمی جنبد   گو بپا ہست ناتواں مہتاب

بمن آں ماہ میکند ہر شب   میکند آنچہ با کتاں مہتاب

تابش از نازکی نیارد یار   بکہ گوید غم نہاں مہتاب

عشرتم را ہے کہن ضامن   شادیم را   مہتاب

تیرگیہا کجا در ارض و سما   ہر دو را ہست درمیاں مہتاب

چہ سبب تفتہ تیرہ تر دلم

نیست امشب مگر نشاں مہتاب

سر بسر بے سود تدبیر من است   تا ز من برگشتہ تقدیر من است

ہست فریادم نہ تنہا در فراق   نالہ ہم گوئی گلو گیر من است

قبلۂ جاں کعبۂ دل کوئے دگر   ہر کرا خوانند غم پیر من است

نارسا و از برق تیر گردد ز راہ   نالہ گوید طرفہ تاثیر من است

تن کہ داغستانم از فرط داغ   آں مخطط چہرہ کشمیر من است

گر سر تیغی بمن دارد قتال   در کف من خامہ شمشیر من است

ایکہ پرسی حلیہ ام آئینہ بیں   حیرت آئینہ تصویر من است

نیست از دل التفات یار ...   گوئی ایں خود بہ تسخیر من است

خوانده ام درس خموشی من ازو
تفته میداند چه تقریر من است

تو ایں مگو به میانجیگری سپر محتاج
که سر به تیغ تو و تیغ تو بسر محتاج

نه آن قدر همه عالم بیک نظر مشتاق
که بنیه زار دل من بیک شرر محتاج

چه باده که نیارد بهیچ گونه خمار
چه ساده که نباشد بکبر و فر محتاج

ستم که تیرگیم را تجلیست چراغ
که داند اینکه بشام که شد سحر محتاج

سوالی از کسی البته ننگ همت هاست
کند نه هر کسی ایں کار را مگر محتاج

نه ایں نه آں نه فلاں نه فلاں درس دولتی
هر آنکه هست غنی قصه مختصر محتاج

مباد خوار شود سنگ سنگ گردد خار
مباد پا و سر ما بیک دگر محتاج

فرشته اجل است آنکه در بدر گردد
سگ در تو نگردد بهیچ در محتاج

بفیض سجده بیخانه نگاه کسی
مباد تفته الهی بما حضر محتاج

شد عدوی جان ما مژگان شوخ
وز کجا شد تا کجا مژگان شوخ

نے من او را بتلا بل صد هزار
نے بلا بل بد بلا مژگان شوخ

من جدا از هر دو و خواهد ز من
دل جدا و جان جدا مژگان شوخ

معرکه خواهم هر زمان بیش را خدا
پیش من تیر خدا مژگان شوخ

می نیارد نشتر بهر رگم
می نفهمد مدعا مژگان شوخ

اگر من می داشتم از عقل و هوش
چشم جادو گر دیا مژگان شوخ

تا چه کام اوست بر دارد چنیں
دست چوں بهر دعا مژگان شوخ

دشمنم از چشم تا ابروی تیغ
قاتلم از غمزه تا مژگان شوخ

اینکه زد خوں در دلم بسیار جوش
چوں نیاید گفت یا مژگان شوخ

بر نگردد روز تکرار از ما دگر
بر نگردد گر ز ما مژگان شوخ

تفتہ تو با فتنہ ہا سازی اگر
فتنہ ہا سازد بپا مژگانِ شوخ

سوے چشم پُر آب می آید — خندہ بر وضعِ خواب می آید
از من آں اضطراب می آید — کہ نہ اندر حساب می آید
رتبۂ خاکسار نیست بلند — کز درِ بو تراب می آید
دل کرا سوخت زیں مے آشاماں — از کہ بوے کباب می آید
شیب می افگند دمی کز پائی — یادِ عہدِ شباب می آید
درِ دل را مگر شکست کسے — مژدۂ فتح باب می آید
می روی از دل و نمیدانی — چہ بجاں خراب می آید
پای او را دگر کہ نیست حنا — خوں ز چشم رکاب می آید
انچہ آید نہ از فلک زنہار — از تو عالی جناب می آید
ما گدا زیم و گوید آں گل تر — تا چہ بوے گلاب می آید
نامہاے دل نوشتہ ام یا جل — مردہ از جا جواب می آید
دردہا از تو داغہا از من — تفتہ روزِ حساب می آید

...اش یکشب پردہ از رخ بے محابا میکشود — آنکہ بر رخ از ادا زلفِ چلیپا میکشود
...عالی از حکمت نمی زد زخم بر ہر عضو ما — تیغ او گوئی طلسم جسم ما را میکشود
...وی شدم جای کہ انجا خامشی در کار بود — مجمعی بود و زبان ہر یک بگویا میکشود
...بشت جنت چوں از رندی بود کاں سنجیدہ صاف — بادہ ایں جا می کشید و راہ آنجا میکشود
...بست بہر زخم تو آغوش زخم سینہ ام — ہمچو آغوشی کہ بر یوسف زلیخا میکشود
...وقت میخوار کی چو میزد حرفی از مژگان او — دل رگِ ابر بہاری را ہما تا میکشود
...تجا بردم عیش پیش فقیہاں زباں — عقدہاے خاطرم یک جام صہبا میکشود

آنکہ می گفتی بمحشر ہم نیابم داد خویش
نقدۂ امروز تو گویا رازِ فردا میکشود

غم از ہمہ عیش جانفزا تر　　بیگانہ تر آنکہ آشنا تر
بر دم ستم تو خوشنما تر　　دلہا ہمہ خوں و دیدہ ہا تر
کے خاک رسد بمرتبہ یاد　　من نارسی و آہ من رسا تر
ہر چند کہ بے نوا من از بس　　از من نے نالہ بے نوا تر
می تر ہمہ گرد ماغ تو خشک　　ای شیخ خوری نہ چوں غذا تر
ہجری کہ برگ بایدش داد　　از مرگ ہم است بد بلا تر
بیجا گلہ اے یاراں چہ حاصل　　از ما گلہ شما بجا تر
گفتنی کہ روا مباد کاے　　پیش تو رواست ناروا تر

گر نقدِ تو آئی از پے سیر
دشتے است مرا چہ خوش فضا تر

از رخت یک گل دنہا در نظر　　باغ ہا در دل چمن ہا در نظر
حور کو جنت کجا غلماں کدام　　اے ادا ہائے تو یارا در نظر
خندہ بر لب می بسر ساغر بکف　　وی خوش آید ساقی ما در نظر
پُر شد و لبیار پُر شد زیں سپس　　اے فراواں جلوہ کو جا در نظر
ساقیا وقت است دیگر از وقت نیست　　ہر چہ دارد مرد دانا در نظر
ہادی ما مرشد ما پیر ماست　　ہر کہ در دنیاست عقبا در نظر
چشم ظاہر بیں الٰہی کور باد　　دوست ہر جا ہست اِلّا در نظر
تیر یار و یاد مرگ و روی یار　　یا بہ پہلو یا بدل یا در نظر
ہر نقش آئینہ باشد دیدنی　　تا چہ می دارد تماشا در نظر

چشم باید بست امروز از جہاں
تا چہ آید نقدِ فردا در نظر

در باغ لالہ را بدمیدن رسید کار — گوئی مرا بجام کشیدن رسید کار

قاصد رسید و گفت کہ کار تو شد درست — حرف دروغ را بشنیدن رسید کار

چشم غزال دیدنم از خود دگر ربود — صبر مرا دگر برمیدن رسید کار

در حیرتم کز آتش رویش چرا نسوخت — چشم مرا چگونہ بدیدن رسید کار

آنجا کبوترم نہ اگر صید دام شد — ہوش مرا چرا بپریدن رسید کار

دل گفت بخلش نرسم بر مراد خویش — خار ترا مگر بخلیدن رسید کار

چوں گفتمش کہ گوشۂ چشمی نہ چوں بمن — گفتا کہ گوشہ را بگزیدن رسید کار

دل قطرۂ و چوں بندای قطرۂ سیم — گویند ہمیں مرا بچکیدن رسید کار

بکشود تفتہ نیز زباں را چو گفت اسیر
"راز نگفتہ را بشنیدن رسید کار"[1]

عجب حالیست طاری بر من امروز — نگردید چوں بعالم دشمن امروز

بمن از ناامیدی خرمن امروز — نہ امید وفا یک ارزن امروز

چہا دیروز با تو خوردنی مے — نصیبم جای می خون خوردن امروز

توسل بوالبشر را خصم و از تو — نہ یک فرد بشر ہست آنِ من امروز

وصال تو نصیبم چوں اگر دید — فراق افتاد در جان و تن امروز

توئی آں گل کہ وصفت گونہ گوں من — شنیدم از زبان سوسن امروز

کشیدم وی نہ یک ساغر بوجہی — کشم من گر وی می صد من امروز

بیا یک رنگی گل بیں بہ بلبل — تماشائیست خوش در گلشن امروز

شہادت گہ نہ چنداں تفتہ دوراست
چہ افتادی چنیں در مسکن امروز

آنکہ گویند ہتم آں کام بیاری کہ مپرس — دارد از پرسش ایں دل شدہ عار نگہ پرسا

---

[1] جلال اسیر: راز نگفتہ را بشنیدن رسید کار — تخم نکشتہ را بدمیدن رسید کار

استخواں سوزیست راچہ دہم شرحِ جز ایں / پنبہ زاری و دردیست شراری کہ مپرس

آنکہ وی مردچہ می پرسشِ احوالِ ایں بیں / خیزد آہے ز لب تازہ مزاری کہ مپرس

عیشِ تو روز وطربناکی عید است کجا / بیکشم نالہ بزاری شب تاری کہ مپرس

بشمار ایکہ کنی بر من بے جرم ستم / ہست پیش آمدنی روز شماری کہ مپرس

ز رقیبے، د شفیقے، تو غمِ دل شنوی / بدو مارا فلک دوں بدیاری کہ مپرس

ایکہ پرسی کہ ترا کرد چنیں دشمن کام / دوستداری کہ چگویم من دیاری کہ مپرس

ہندوی زلف تو آں دشمن دین است کہ میں / آہوے چشم تو آں شیر شکاری کہ مپرس

رفت بر باد پس از خاک شد نہاد ہنوز
ہست در خاطرش از تفتہ غباری کہ مپرس

دردا کہ دردِ ما شنیدہ است ہیچ کس / زنہار جز خدا نشنیدہ است ہیچ کس

عشرت قرینِ ما نشنیدہ است ہیچ کس / از غم مرا جدا نشنیدہ است ہیچ کس

آہ از گلی کہ لب نکشاید بکس ز شرم / پیغامش از صبا نشنیدہ است ہیچ کس

ما و غم فراق کہ آخر کند ہلاک / ایں درد را دوا نشنیدہ است ہیچ کس

گو مدعی بنوع دگر میکند بیاں / زو حرفِ مدعا نشنیدہ است ہیچ کس

تمکین اوست آنکہ چہ ما تم سخن ازاں / از کوہ او صدا نشنیدہ است ہیچ کس

گو آمدہ است قاصدی از کوی او ولی / جز مژدۂ بلا نشنیدہ است ۔ ہیچ کس

گویم چہ ایں کہ روی تو با مہ برابر است / خورشید را سُہا نشنیدہ است ہیچ کس

با تفتہ ہر چہ می نسزد گرچہ گفتہ
از تفتہ ناسزا نشنیدہ است ہیچ کس

خوں گر دو ہر دم از مژہ اے دل چکیدہ باش / جای رسیدہ باش وہماں نا رسیدہ باش

ناکام تر کسے کہ بود آرمیدہ تر / رام تو کام می شود از خود رمیدہ باش

گر عاشقی بگلشنِ فردوس رو مکن / در دامن امید گل یاس چیدہ باش

انجام رنگ و بوی اگر در نظر بود / صد رنگ دیدہ باش و صد بو شنیدہ باش

ایں کوہمان وقاتل خنجر بکف ہماں ۔ اے دل ترا اگر گفت بروآرمیدہ باش
وصل کیست وصل توائے خنجر کے ۔ یکدم بپہلوئے من ہجراں کشیدہ باش
دندان تست تیز گراں گو نہ جان من ۔ برخود میاز ما ولب ما گزیدہ باش
پیش آرد انچہ گردش گیتی قبول کن ۔ نماید انچہ آئینۂ چرخ دیدہ باش
از دیر برہمن چو سخن سر کند شنو ۔ وزکعبہ شیخ دم چو زند بے عقیدہ باش

تانفتہ غیر ازیں چہ مرادت زشاعریست
مضمون نامرادی خویش آفریدہ باش

من چہ بگویم دگر از کار خویش ۔ بست ز کوئے تو دلم بار خویش
عذر کہ در آمدن آری چنیں ۔ یاد نیاری زچہ اقرارِ خویش
حکم پئے گریۂ مفر ما بمن ۔ رحم بکن بر در و دیوارِ خویش
پیش خداہم نکشائے نقاب ۔ دانی اگر خوبی رخسارِ خویش
راندیم از بزم بدیں سان چرا ۔ خواندیم از تار اگر یار خویش
خفتہ ام اندر لحد و میکنم ۔ ناز چہ بر طالع بیدارِ خویش

توچہ کنی سرزنشم زاں سخن
خود خجلم تفتہ ز اظہارِ خویش

فغاں از خنجر چشم سیاہش ۔ دگر فریاد از تیر نگاہش
نیم خواہی نخواہی داد خواہش ۔ نمی دانم چہ رو داد اشتباہش
رخ جاناں ہماں ماہ تمام است ۔ کہ چشم من ندید از چند ماہش
کمش دانم نہ از عرش معلّا ۔ کجا بارم بعالی بارگاہش
خوشا آں مردگر خوباں مطیعش ۔ فدائے آں مرا نجم سپاہش
دلم گر توبہ از مے کرد و آں خود ۔ گناہ آمد خدا بخشد گناہش
کسی کو قد موزونِ تو دیدہ است ۔ بود سرو گلستانِ وی آہش
گہی آنکو فراموشت نسازد ۔ چہ سازد گر نیزی گاہ گاہش

سخن رانی چہ از رفعت پناہی　　　قدرت سروے و رفعت درپناہش

چو گفتم ایں تبسم تفتہ را کشت
بخندید و بگفتا کو گواہش

ایں دم چو نہ آں سرو رواں است دریں باغ　　　ہر برگ گلم آفت جان است دریں باغ

تا بر جگر بلبل دل خستہ چہ آید　　　در دست گل از تیرہ شاں است دریں باغ

حیف است اگر گل ہمہ تن گوش نگردد　　　بلبل ہمہ تن سحر بیان است دریں باغ

گر منتظر آمدن نو گل من نیست　　　نرگس ہمہ سو چوں نگران است دریں باغ

تونیں مژہ ام ایکہ بجز لالہ نکارد　　　بنگر کہ چہا لالہ ستان است دریں باغ

ہر لالہ و گل بر صفت داغ دلم گیر　　　رازم نہ نہاں جملہ عیاں است دریں باغ

یکسو سمن و سنبل و یکسو گل و ریحاں　　　بخرام کہ سیر دو جہان است دریں باغ

از تفتہ چہ گوییم کہ بہ پیری چہ حالش
صبح است و چو شبنم دوساں است دریں باغ

مردیم بد شمناں مبارک　　　رفتیم با آں جہاں مبارک

ایں رتبہ ات الفلال مبارک　　　شد خاک درت جناں مبارک

مژگاں چو بہم زدی فلک گفت　　　جنبیدن ایں ستاں مبارک

زاں پیش کہ خوں خورد زبیم　　　شد دشمنم آسماں مبارک

در دل چو گرفت جا غمم او　　　گفتم بہ مکین مکاں مبارک

بر من چو خدائی من نہ بخشود　　　شد عشق خدایگاں مبارک

او تیغ زد و مرا بصد ذوق　　　دل گفت کہ امتحاں مبارک

زاں صبر کہ گشت گم دلم را　　　تا یافتن نشاں مبارک

نیجا شدہ بود جسم و اینک　　　بے مغز شد استخواں مبارک

مارا کہ محقریم یکتا　　　کو صد ریک آستاں مبارک

مرگی کہ بہ تفتہ کینہ ہا داشت
امشب شدہ مہربان مبارک

خدارا خانہ باشد خانۂ دل   من عاقل تو شادی دیوانۂ دل
زصد ہا گوہر یکدانہ خوشتر   نثارت گوہر یکدانۂ دل
ز اشک او کہ سیلاب ست آمی ترسی   رداری آبادی اندویرانۂ دل
بچاک دل مگر بکشودہ چشم   پے زلف تو شایان شانۂ دل
یکے حسرت دوم اندہ سوم درد   چکد دیگر چہ از پیمانۂ دل
محبت چوں اندرو شد جنتی شد   کم از جنت مداں کاشانۂ دل
زند خود را بدم خنجر کہ زینساں   فدائے ہمت مردانۂ دل
نہ خالی یک نفس از ذکر خیرش   فسوں گر چشم او افسانۂ دل
حدیث آشنایان مختصر کن   مبادا غم شود بیگانۂ دل

چو گفتم تفتہ چیزی ہاے فروشد
بگفتا یک نگہ بیعانۂ دل

چنیں بت کجا بت چنیں گل کجا گل   بہ بتخانہ ہا بت بہ گلزار ہا گل
ببیں ریخت دوران چہ رنگ تماشا   بہ گل مبتلا من بہ او مبتلا گل
ہوای گل او را کشد تا گلستاں   ندانم کہ در سر چہ دارد ہوا گل
منم بلبل آنکہ وصفش چگویم   نگارم گل است و چہا خوشنما گل
دم نشہ در صحن بستاں دلم را   خوش آمد چہ پیمانۂ مل خوشا گل
چہ خوش گلگل از می شگفتی دم صبح   بیا در چمن ای بہ رویت فدا گل
کنیم ایں سبق کاش از بر من و تو   تو بلبل مرا خوانی و من ترا گل
ز بے تو کشد از چہ آہ رسا سرد   ز بے تو دردا زچہ جیب قبا گل

مپرس ایکہ چوں ماہ میروی تفتہ در باغ
دل اندہ نصیب است واندہ ربا گل

چہ می خواہد سکون جاں علاج اضطراب دل — ملال بے شمار جاں نشاط بے حساب دل
دوم بجو دبصحرا اگر کسی جوید نشان من — بگویم مست و شیدا اگر کسی پرسد خطاب دل
اگر صدہا نسخ بینی نخوانی غیر ازیں مصرع — غم او انتخاب دل غم او انتخاب دل
کنوں در ہر سوال او چہ بندی لب بیا آئیں — چہ خواہی گفت پیش داور محشر جواب دل
چہ امنت کشم زنیساں زساقی تا کشم آں را — نباشد از شراب احمر رخ کمتر خون ناب دل
تمنائے عدم دل را چہ از جان بیشتر باشد — برابر کی تواند شد و رنگ جان شاداب دل
کسے کو بشنود آں را کجا ماند بحال خود — تو کے بشنیدہ باشی جان من حال خراب دل
دل من آنکہ از حق ہر چہ خواہد در دمی یابد — بترس اے رفتہ از دل از دعائے مستجاب دل
توئی دلجو توئی دلبر توئی دلدار شیرنگار — بغیر از تو کہ یابد مدعائے کامیاب دل

بیا ساقی کہ ورد تحفہ اکنوں غیر ازیں نبود
بفصل گل شکست توبہ باشد فتحیاب دل

زبس عبرت از اہل دنیا گرفتم — کمر بستم و راہ عقبیٰ گرفتم
چہ گویم چہ دیدم ترا تا شنیدم — چہ گویم چہ دادم ترا تا گرفتم
تو در جلوہ کن جلوہ تو کز تماشا — اجازت برائے تماشا گرفتم
اگر مدعی حرف گیر است من ہم — قلم در کف ایں جا بجو اگرفتم
دل من بملک طرب تاخت آورد — من اقلیم غم را سراپا گرفتم
بمستی کہ جیب صبوری دریدم — بوحشت کہ دامان صحرا گرفتم
توئی کایں ہمہ اشک و آہم نمودے — تمم کز ثری تا ثریا گرفتم
تو سر تا سرائے من خموشی گرفتی — من ارض و سما را بغوغا گرفتم
من آنم کہ گر در سر مرگ گشتم — بدشمن طریق مدارا گرفتم
نمک آب شد خندہ ات تا بلب زد — شکر ریختم بوسہ ات تا گرفتم
چہ دیدم کہ پیمان حسرت شکستم — چہ کردم کہ تام تمنا گرفتم

زکس ہیچ نگر فتن آمد عجب فن
دریں فن ترا گفتہ یکتا گر فتم

غلط است ایں کہ بخود لطف شمائی گویم — انچہ ہرگز نتواں گفت چرائی گویم
شکن زلف ترا یال ہمائی گویم — دیں چگویم کہ چہا زلف ترائی گویم
ہست رازی کہ بخود نیز نباید گفتن سے — انچہ با غیر جدا با تو جدائی گویم
شادیش یک طرف انجام تفہیم آں را — بشنوم گر ز تو حرفے ہماجائی گویم
ہرچہ در زیست نگفتم نشنیدی اکنوں — از جہاں میردم و با تو دعائی گویم
تو نمی گوئیم اے جان تغافل کہ برو — یا اجل من بہ تشاطی کہ بیائی گویم
ہرچہ می گوئیمت از بسکہ تیم آخر بیں — نخلا گفتنی است ویلائی گویم
پیش ازیں در صفت شاہ قصاید گفتم — مرد امید وکنوں مرثیہ ہائی گویم

تا چہ سر خوش شوی اے تفتہ ازیں تمہیدم
پیش ساقی سخن از ابر و ہوائی گویم

دستم آں کہ خود را پیش دل ہشیاری داتم — دل خود را زجا بے خودی شہاری داتم
بے انکار را اقراری دانستم واکنوں — چو نومیدم بے اقرار را انکاری داتم
چنانم گریہ را مشتاق و زانسانم ز خود رفتہ — کہ زخم خونچکاں را دیدۂ خونباری داتم
من واز سعی بخت خود شدن در خواب گاہ او — عجب دیوانہ ام کایں خفتہ را بیداری داتم
چو پرسم یا فلاں کس شب کجا ماندی نگوئیم — کہ می او را نمی داتم منت عیاری داتم
چہ گفتی ایں کہ تو سود و زیان خود نمی دانی — تو بودی پیش دلالی سر بازاری داتم

تو شعر تفتہ را از نام خود اے آں کہ می خوانی
نہ گفتار یست چنیں من طرز ہر گفتاری داتم

بیا خال جبین انورش بیں — چہ تا ید بہ بلندی اخترش بیں
اگر صد سال جستی دیگرش جونی — دگر صد بار دیدی دیگرش بیں
چساں افتد زمیں در پاش بنگر — چساں گردد فلک گرد سرش بیں

دمی جاں بر کرا نادیدہ اینست   بیا عیسیٰ لب جاں پرورش بیں
ز صد گلزار خوشتر می نماید   گلی بر سر بگلزار اندرش بیں
کسے کز خضر می جوید سراغے   تراز خون مسیحا خنجرش بیں
پچھامی تاید امشب مہ بگردوں   بچھامی گردد این دم ساغرش بیں

کہ می گوید ستانش را نماند آب
بہ نعش تفتہ مژگان ترش بیں

بیا زاہد لب پر شکرش بیں   بہشتی ہست رویش کوثرش بیں
نگویم غمزہ غارت گرش بیں   معین غمزہ چشم کافرش بیں
چہ رفتار است رفتارش تواں یافت   چہ محشر گردد بر پا محشرش بیں
ندیدی گرشہ بیدین مارا   رواج کفر اندر کشورش بیں
گروہ بے کساں بر رہ گزارش   ہجوم داد خواہاں بر درش بیں
یکے مرغ دلم تو مید ازاں بام   دگر روح الامیں بال و پرش بیں
چنیں فصاد جاں پرور کہ دیدا ست   رگ جانہا فدای نشترش بیں
کسے کا فتادگی از سر گرفت است   بزیر پا مقام برترش بیں

حساب تفتہ پیش از حشر شد پاک
خدایش را نگر پیغمبرش بیں

بزم احباب را تماشا کن   عالم خواب را تماشا کن
بقفہ بیش بنو دایں سر برگ   گلِ سیراب را تماشا کن
آدمی تا چہ کرد و تا چہ کند   قطرۂ آب را تماشا کن
محرم از نقد و جنس ہیچ نگوی   رفتم اسباب را تماشا کن
نفع و نقصان دو یار غار ہم   بحر و گرداب را تماشا کن
دل دکانِ وفا کشود بیا   جنسِ کمیاب را تماشا کن
درد کا شادہ تا سحر باز است   چشمِ بے خواب را تماشا کن

عشق را از ادب سلام کنم — حسن آداب را تماشا کن

گردش چرخ را دگر چه نظیر

تفته دولاب را تماشا کن

غمت هست در جسم ساری ببین — عجب حالتی هست طاری ببین

چه بینی سوی غیر و جوی قرار — سوی من نگر بیقراری ببین

ندیدی اگر خنده هائی سحر — زند خنده ها زخم کاری ببین

ندیدی اگر ماجرای عجیب — ز روی تو دم شرمساری ببین

توری غم چه بر سینه ریشی من — جگر خستگی دلفگاری ببین

مسیحا هم این نوع نپرده بود — دمی از حضر جانسپاری ببین

ستم کار مژگان و چشم ترا — چه خوش می کند پیشکاری ببین

کنون حال من هست تا گفتنی — تو تاب شنیدن نیاری ببین

چه می بینی این زخم را ای عدو — خود آن تیغ را آبداری ببین

کمی تا چه از دردمندان شمار

بیا تفته را و شماری ببین

خوش است تابع تقدیر بایدم بودن — نه این که در پی تدبیر بایدم بودن

بیئے که گفت هلاک تو خوشتر است اورا — هلاک شوخی تقریر بایدم بودن

که خیز من این همه رنگین سخن بکاغذ ریخت — چرا نه حاکم کشمیر بایدم بودن

بپرسد از من اگر راز نقش هستی کس — مثال حیرت تصویر بایدم بودن

تو اینکه ناوک دل دوز داری اندر کیش — بزن بدل ز چه دیگر بایدم بودن

هزار میکده بشکست نرگس مستت — کرا کرا گل تعبیر بایدم بودن

بگفت چرخ شدن طالعت جوان سازد — باین اشاره گر پیر بایدم بودن

بقتلم آن بمه تقدیم تو استی اکنون — چگونه کشته تاخیر بایدم بودن

تو گفته کمی را بخواب کشتم دوش — دگر بخواب که تعبیر بایدم بودن

مراں کہ خاک شوم بر در تو استغنا — زبسکہ نسخۂ اکسیر بایدم بودن
بہ تفتہ آنچہ کنوں میکنی نہ بے وجہ است
شہید ایں ہمہ توقیر بایدم بودن

تو دو او شاہ است و مژگان لشکر او — مسلماں کش دو چشم کافر او
تواں بر بخت عاشق گریہ ہا کرد — چکد حسرت ز دیوار و در او
دلے دارم کہ لبریز است از زخم — سراو سینۂ او پیکر او
بلاگردِ سرم بسیار گردد — نگردم من چرا گردِ سر او
بجا دعوای یکتائی ازاں داغ — کہ مہر خور بود بر محضر او
دریں میداں عدو گو تشنہ میر — چشم من جملہ آب خنجر او
پر دچوں نامہ ام خود سوے معشوق — چہ پروایم ز جبریل و پر او
ز شمشیرش عدو گو چشم می پوشی — بجز عاشق کہ بیند جوہر او
دریغ از غارت دین و دل ہوش — فغاں از غمزۂ غارتگر او
مپرس از عاشق اندوہ شب ہجر — شب ہجر است روز محشر او
کند ظاہر نفاق تفتہ و من
لب خشک من و چشم تر او

دریافتم از ہدایت تو — اے دل ہمگی نہایت تو
اندازہ نما تدانمت را — و ز حد بگزشت حسرت تو
ہرگز نہ از حقیقت آگاہ — آگہ شدم از حقیقت تو
فرسود زبانم از نصیحت — دیگر چہ کنم نصیحت تو
شد صرف تو ہر چہ بود با من — ایں مفلسیم بدولت تو
یا رحلت تو مسرت او — یا قامت او قیامت تو
خواہاں ملامت تو خلقیست — خواہم ز چہ من سلامت تو
از عافیت خود آیدم یاد — ہرگہ نگرم مصیبت تو

بستم ز تو دیده یعنی این نوع — دیدن نتوان مذلت تو
تا کرده ترا که رخصت از عار — رخصت شده تابِ طاقت تو
می گشتی اگر تو به ز فرهاد — می داد که دادِ محنت تو
با آنکه تو خویش را نگشتی — معلوم که گشت قدرت تو
دوشت بدو کون می خریدند — امروز چو نیست قیمت تو
بس کن بس کن — کشیم دیگر
تا کے من و تفقه — زحمت تو

خضر و مسیح دیگر اند رچه کار هر دو — تیغ اگر برارے امیدوار هر دو
روز و شب است حاصل یکی که نتوان دید — خورشید و ماه او را آئینه دار هر دو
چون گفتم از من و دل حرفے شنیده باشی — گفت از ادا که دانم بے اعتبار هر دو
خواه این ز ندر به هم خواه این فتنه از حکمت — بگذاشتم بخوبان من کار و بار هر دو
می آنکه هر یک از من گوید هر آنچه گوید — نام مرا چه پرسی رسوا و خوار هر دو
دیگر در انتظارت چشم مرا چه افتد — چون نقش پاے بینم بر رهگذار هر دو
احوال لاله و گل بود است بے تو یکسان — هم سینه ریش هر دو هم دلفگار هر دو
بے مصلحت کشادند آغوش سے که دل و جان — زخم ترا کشیدند اندر کنار هر دو
او مضطرب بقلم من از نشاط نخود — معشوق و عاشق اینجا بے اختیار هر دو
یاری که رفت یا او دیگر چه کار ما را
یعنی که یاس و حسرت با تفقه یار هر دو

این قدر زود کجا آمدۂ — روز محشر آمده تا آمدۂ
کس چه داند که چرا آمدۂ — بهر صیدِ دلِ ما آمدۂ
می بسر جام بکف شیشه بید — عیدِ مستان که چها آمدۂ
چشم بد از رخ نیکوی تو دور — چه قدر عشوه نما آمدۂ
باغِ حسن تو و نیرنگی ها — گل جدا لاله جدا آمدۂ

گفتی آں رفت کہ کشتم نہ ترا یاری اکنوں بوفا آمدۂ
تا کجا تشنۂ خوں بود ایں تیغ تا کجا کام روا آمدۂ
کام دل کس چہ ربا بد از تو مست من ہوش ربا آمدۂ
ساقیا چوں نہ روم قربانت خوشتر از ابر و ہوا آمدۂ
تفتہ اکنوں ہے ومیخانہ زلست
سربسر صدق و صفا آمدۂ

ایں لحظ از تو دم چو ملکہ رشنیدۂ گفتن چہ سود ازیں کہ چہ دیگر شنیدۂ
زیں سال ترا زسو فتن ما وغیر حرف پرواز دیدۂ و سمندر شنیدۂ
ترکیست چشم او کہ کشد یاس را بخوں اے دل دگر بدست کہ خنجر شنیدۂ
غم بیشتر مرا بود و غصہ بیشتر زاں بیشتر ہنوز تو کمتر شنیدۂ
تو اش زحمتی کمر و رسد اے دل مروز جائے زاں رہ چہ زحمتی کہ ز داور شنیدۂ
رنگے دگر برو ی تو گل کردہ است شیخ بوئے دگر ز بادۂ احمر شنیدۂ
ذکر وتا کجا ز تو دلبر شنیدہ ام حرت غلط کے از من مضطر شنیدۂ
دہر از مگس پراست ز عنقا نشاں مجوی درویش دیدۂ و توانگر شنیدۂ
ہر گہ کہ رخش ناز بمیدان دواندۂ
انجام خاک تفتہ ز صرصر شنیدۂ

بدمست کشتۂ و دلِ ما شکستۂ مردم گماں برند کہ مینا شکستۂ
پژمردہ است باغ تمنائے مردمم خارے بپائے مرگ ہما نا شکستۂ
چوں ایں قدر نہ بادہ بشکرانہ اش کشی جامِ مراد صد چو منی را شکستۂ
گویند شد طرت تو گل باز شد نہاں قفلِ در چمن نہ تو بیجا شکستۂ
از غسل محبت تو کنم شکر ہا وے پرہیز سال دلم چقدر ہا شکستۂ
بے مطلب ایں تمط نہ برا غنیا وی زاہد تو قدرِ دیں پئے دنیا شکستۂ
پیراہن صبوری ما دل شکستگاں چاک است چاک طرت کلہ تا شکستۂ

تا از شکست و بست وی آرم بلب حرف   یا بستهٔ تو دست مرا یا شکستهٔ
تابوت رفته از در تست ای برگراکه تو   دیوار خانه بهر تماشا شکستهٔ
تا این چه گریها یغم غرق گشتنم   یاد آر کشتیٔ که به دریا شکستهٔ

آید چرا ز تفته همیں پرسیم بطنز
واگه نهٔ هنوز کرا یا شکستهٔ

پایت بچمن نمی گزاری   منت بسمن نمی گزاری
اندازه بریدل ابچه داری   جانے بہ تن نمی گزاری
لطف تو بزخم ماست بسیار   مشکے بختن نمی گزاری
من شکر گزار این هم از تو   کے شکوہ زمن نمی گزاری
منصور صفت کسی که بینی   بے دار و رسن نمی گزاری
یک گل بچمن بگویم اصلا   یک کس به زتن نمی گزاری
من نعرہ زدن نمی گزارم   تو تیغ زدن نمی گزاری
کے لب نکشائی و کے احسان   بر جان سخن نمی گزاری
اینک غم روزه ات مرا خورد   چیزی بدهن نمی گزاری
دریا کشم و برم تو ساقی   جز یک دو سمن نمی گزاری
کے زنده گزاریم تو نباش   بر مرده کفن نمی گزاری

گر تفته کشی فغاں بخلدی
خلدی به جهنمی گزاری

نیست کم ز انکار اقرار کسے   تا چه باید گفت ز انکار کسے
گفت می آیم کسے را من بخواب   رشکها بر بخت بیدار کسے
ندرتے دارد درین دوران وفا   قاصد در هنگام اظهار کسے
دولت او، بخت او، اقبال او   مرگ اگر باشد طلبگار کسے
چون رہد جاں از بلائے نوکر من   پیرو دل دل گرفتار کسے

من نخواہم از کسے چیزی دگر — اے صبا بوئے زگلزارِ کسے
وقفِ حسرت مدعی گوشش کسیست — نشنوم زنہار زنہارِ کسے
خوارم و ذلت بخوبی داندم — تو چہ دانی قدر و مقدارِ کسے
یوسفِ من غم بروائے خوش دلی — من نمی گردم خریدارِ کسے
سبزہ می غلتد چناں کاندر چمن — زلف می رقصد بر رخسارِ کسے
اینچناں کز وعدہ خرسند است دل — ہمچناں امسال ما پابرِ کسے
محو مطربِ عیش جاوید کسیست — چشم ساقی جام سرشارِ کسے
گفت دل رو تا چہ گفتارِ دل است — رفتیم از خود تا چہ رفتارِ کسے

من کنم بیگم اسیرو تفتہ را
کس میادا ایں چنیں زارِ کسے

نمی شود زچنیں کس خدا چناں راضی — نہ دوستاں کہ زمن جملہ دشمناں راضی
چنانکہ من نیم از سیر بوستاں راضی — دل من است نہ از شاہی جہاں راضی
گماں مبر دلم از تو چہ جاں دگر ندہد — من از یقین تو ناشاد و از گماں راضی
یکیست جان و بہر عضو نغزی چون است — زیک عزیز بود جملہ کارواں راضی
کدام سرو پئے سیر تنجہ کرد قدم — کہ تازہ رو ہمہ باغ است و باغباں راضی
خضر نیم کہ زیم ہرزہ بے رمعشوق — وگر بزیستن خود مرا مداں راضی
براشک و آہ من لے بیقرار یک رہ بیں — کہ ہم رکاب چہ شاد و چہ ہمعناں راضی
خدنگ تو بگزشت از دل و بدل جاں گفت — چہ میزباں کہ از و نیست میہماں راضی
مرو گر آمدہ از دعا من مہجور — زمقدم تو اجل راضی و بجاں راضی

تو حال تفتہ کہ پرسی بس ایں قدر کہ کنوں
بمرگ خود چقدر ہاست یک جہاں راضی

ایں نمی خواہم نسیم باغم اے دل شوی — بر چراغ مدعائے مدعی صرصر شوی
ہم چناں جلا دہی و تو ابن مریم گر شوی — ہرگز ایں باور نمی آید کہ جاں پرور شوی

خوش دم صبح و دعا را نیز اثر ایں دم مرا — گر چشانی قطرۂ مے ساقی کوثر شوی
ایکہ گوئی دشمنت را بعد ازیں بینم عدو من — گر نہ بینی یکدم او را تا بکجا مضطر شوی
آں قدر نالم کہ بر گوشت رسد صد گونہ بیخ — وانقدر گویم کہ از خجلت تو اے گل تر شوی
گر کنی صد رہ ستم کے از ستم توبہ کنی — در روے یکرہ بجنش فتنۂ محشر شوی
تو نصیحت نامہ ہا خوانی و من از غم ہلاک — اے ستم ایجاد می ترسم گرم گستر شوی
وے بمن پیر طریقت ایں بگفت و زد قدح — گر نہ نوشی مے بماہ روزہ ہم کافر شوی

گنبد بیدر ہمیں یک دہر و دروی صد بلا
تفتہ بروں از چہ رہ زیں گنبد بیدر شوی

کتابیات

بزم غالب	عبدالرؤف عروج	کراچی، ادارۂ یادگار غالب ۱۹۶۹ء
پنج آہنگ	ترجمہ محمد عمر مہاجر	کراچی، ادارۂ یادگار غالب ۱۹۶۹ء
تضمینِ گلستاں	تفتہ	کانپور، نول کشور ۱۸۷۳ء
تلامذۂ غالب	مالک رام	نکودر، مرکز تصنیف و تالیف ۱۹۵۷ء
خطوط غالب	مرتبہ مالک رام	علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۶۲ء
خطوط غالب	مرتبہ مہیش پرشاد	الٰہ آباد، ہندستانی اکیڈمی ۱۹۴۱ء
خمخانۂ جاوید (حصہ دوم)	لالہ سری رام	دہلی، دلی پرنٹنگ ورکس ۱۹۱۱ء
دیوانِ چہارم	تفتہ	۱۸۶۹ء
ذکر غالب	مالک رام	نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ۱۹۵۵ء
روز روشن	مظفر حسین صبا	بھوپال، مطبع شاہجہانی ۱۲۹۷ھ
سنبلستاں	تفتہ	میرٹھ، مطبع مرآت الصحائف ۱۲۷۸ھ
صبح گلشن	سید علی حسن خاں	بھوپال، مطبع شاہجہانی ۱۸۷۸ء
غالب اور سرور	ایم حبیب خاں۔	انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔ ۱۹۷۵ء
فیضانِ غالب	عرش ملسیانی	نئی دہلی، غالب اکیڈمی ۱۹۷۷ء
گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر	لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۶ء
گلشن ہمیشہ بہار	نصر اللہ خاں خویشگی	کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۷ء
مکاتیب غالب	مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی	بمبئی، مطبعہ قیمہ ۱۹۳۷ء